دشتِ شب

جاوید شیدؔا



حصۂ ادب برائے حقانی پبلک لائبریری کا حصہ

بصد خلوص!

[illegible]

۱۵/۱/۲۰۲۳

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

دشتِ شب

لو آج سر کو دَشنہ و خنجر پہ رکھ دیا
لو آج ہم بھی صاحبِ دستار ہو گئے

دَشتِ شب

جاوید شیدؔا

سیوا پبلی کیشنز

133 سرکلر روڈ شاہ عالم چوک، لاہور فون: 7671975

ضابطہ

کتاب		''دَشتِ شَب''
شاعر	:	جاوید شیدآ
ناشر	:	حسان جاوید چوہدری، ریان علی، محمد ہرسم ارغوان چوہدری
کمپوزنگ	:	محمد فرخ جاوید
سرِورق	:	مُداس
تزئین	:	کرن ارغوان، نبیغہ جاوید، عشال علی
اشاعتِ دوئم	:	۱۸ جنوری ۲۰۲۲
تعداد	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۵۰۰ روپے (20 امریکی ڈالر)
پبلشر	:	ارغوان پبلیکیشنز۔ فون 92-0300-8020875+
ای میل	:	javaidshaida@gmail.com

انتساب

پیارے بیٹے ارغوان جاوید چوہدری کے نام

جس نے دس (۱۰) برس کی عمر میں ہی ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکہ کے موقع

پر

اپنے اندازِ سُخن سے متاثر کیا

لو آج ہم بھی صحنِ گلستاں میں آ گئے

خوشبو کی وہ جو راہ تھی ہم راہ پا گئے

ارغوانؔ

ہر شخص کو ملتی نہیں بینائی بھری آنکھ
ہر شخص کو ہوتا ہے کہاں حُسن کا اِدارک

فہرست

ابتدائیہ

صدر بازار لاہور کینٹ کا علاقہ ادبی اعتبار سے زرخیز واقع ہوا ہے۔ یہاں سیّد عابد علی عابد، سیّد عبدالحمید عدم، ازہر دّرانی، اختر رومانی جیسی عظیم شخصیات ہو گزری ہیں۔ شہزاد احمد اور اُفق دہلوی آج بھی ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جاوید شیداؔ کا تعلق بھی اسی علاقہ سے رہا ہے۔ ان کے والدِ محترم چودھری ایم اے شیداؔ بھی یہاں موجود ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاوید شیداؔ نے بھی ان شخصیات سے کسی نہ کسی صورت اِستفادہ کیا ہوگا۔

جاوید شیداؔ اپنی سرکاری مصروفیات سے خدا جانے کیسے شعری تخلیق کے لیے وقت نکالتے ہوں گے۔ میرا اپنا قول ہے ''شاعر، شعر نہیں کہتا بلکہ شعر، شاعر کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے'' یہی قول ان پر بھی صادق آتا ہے۔ ''دشتِ شب'' کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کا اپنا لہجہ اور اپنی اُپج ہے۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ نے کہا ہے کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔ جاوید شیداؔ کے کلام میں بھی تصوف کا پرتو پایا جاتا ہے۔ بالخصوص معاشرہ کی ناہمواریوں کی طرف بڑی چابک دستی سے اشارہ کرتے ہیں۔ صوفیاءِ کرام نے صلح جوئی کا پیغام تو دیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ، اصلاحِ معاشرہ کے لیے تگ ودَو بھی کی ہے۔ شعر اس کارِ خیر کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

جاوید شیداؔ ہمارے معاشرہ کی ایک عبرت خیز مجبوری کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وہ لاش ہوں میں جس کو یہاں تک خبر نہیں
شیداؔ مری حیات کو کس نے بسر کیا

صلح جوئی کا پیغام خوب دیا ہے:

شیدا! آؤ اب تو مل کر
بہتر کچھ حالات کریں

ان کا درجِ ذیل شعر اِنسانی روح تک کو ہلا کر رکھ دیتا ہے:

بس تصویروں میں شیدا
باقی اب ہریالی ہے

مجھے یقینِ کامل ہے کہ جاوید شیدؔا کی شعری تخلیق تحسین کے پُھول کھلائے گی۔

دُعا گو

بشیر رزمی

۱۲ جنوری ۲۰۱۱ء

جاوید شیدؔا اور "دَشتِ شب" ایک دوسرے کا عکس

دشتِ شب کا مسودہ مرے ہاتھ میں ہے اور حکم ہے کہ اس پر چند سطور لکھی جائیں ۔یہ بڑی بات ہے ورنہ جاوید شیدؔا وہ شخص ہے کہ جس کے لیے بڑے سے بڑا نام بھی بلا عذر کچھ لکھنے پر آمادہ ہو۔ یہ جاوید شیدؔا کی شخصیت کا طلسم ہے کہ وہ اپنی خوبصورت شخصیت کی سادگی میں بے پناہ اپنائیت لیے ہوئے ہے۔ یہ خوبی خاندانی ماحول کی مرہون بھی ہے اور مُرشدِ کامل کے قدموں میں بیٹھنے کا ثمر بھی!۔ پیشہ ورانہ طور پر جاوید شیدؔا تعلقاتِ عامہ کا افسر ہے اور یہ افسری ہر طرف اور ہر طرح کے تعلقات کی متقاضی ہے۔ سو یہ نوکری جاوید شیدؔا کیلیے ایک تیر دو شکار بلکہ کئی شکار ثابت ہوئی۔ پروٹوکول کی ڈیوٹی اس ہمہ وقتی مستعد شخص کی فطرت کے قریب تر ہے۔ ہر شعبہ زندگی سے متعلق اداروں اور اشخاص سے مراسم اُس کی مجبوری تھے لیکن آفرین ہے اس مردِ دانا پر کہ اس نے ضرورت کو شوق بنا لیا۔ لکھنے لکھانے کا شوق پرنٹ اور سکرین میڈیا سے تعلقات کو مزید مستحکم کر گیا پھر الیکٹرانک میڈیا اور خوبصورت اندازِ گفتگو نے سکرپٹ رائٹر۔ اینکر اور کمپیئر بھی بنا دیا۔ ادبی لوگوں سے مراسم رکھنا ضروری تھا تو ان کا حصہ بننے میں ہی عافیت جانی اور یوں کبھی افسانہ لکھا تو کہیں کوئی ناول لکھنا آغاز کر بیٹھے، ساتھ ہی ساتھ شاعری کو بھی اپنی دسترس میں لینے کی ٹھان لی۔ نہ

صرف ٹھان لی بلکہ اس میں ایک معقول اور معتبر سطح تک نام کرلیااور نوبت بہ ایں جارسید کہ اپنا مجموعہ مرتب کرلیا۔ وہی مجموعہ جو آج کی اس ساری تمہید اور بعد ازاں آنے والی تحریر کا موجب ہے۔ شو بز والوں سے اچھی تعلق داری نے اِن سے کئی ڈرامے لکھوا مارے ۔اصلاحِ معاشرہ کی گُرن اور حرف شناسی اخباری کالم "حرف شناس" کی صورت منظرِ عام پر ہے۔غرض جاوید شیؔدا کی زندگی از خود ایک مکمل سول سوسائٹی کی مثال ہے۔شیریں زُبان ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گُفتار بھی ہیں۔ کسی شہر، کسی شہر کے کسی دفتر، کسی بھی شعبہ زندگی کا ذکر کریں، جاوید شیؔدا بیک زبان کتنے ہی لوگوں کے حوالے گنوانا شروع کردے گا۔
کسی موضوع پر بات کریں خواہ وہ سائنس ہو، ادب ہو، مُعاشیات ہو، عمرانیات ہو، موسیقی ہو، مصوری ہو، مجسمہ سازی ہو، فوٹوگرافی ہو، کتاب ہو، گائیکی ہو یا اسلامی تاریخ جاوید شیؔدا بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ اُس گفتگو کا ایک حصہ بن سکتا ہے۔ حافظہ اس قدر بلا کا ہے کہ مجھے اکثر رشک ہوتا ہے۔ ہر کام اس قدر سرعت اور صفائی سے کرتا ہے کہ خامی ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتی۔ کمال درجے کا Presenter ہے۔آرکیالوجی سے لے کر روحانیت اور صحت کے اصولوں سے لے کر تمام تر طریقہ ہائے علاج اور اس سے متعلقہ نسخے تک ہمہ وقت اس کی نوکِ زُبان پر رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل اگرچہ طویل ہوگئی ہے لیکن یہ دانستہ کیا گیا ہے۔ یہ طوالت بے معنی نہیں ہے۔ اس کا مقصد قارئین تک "وَشتِ شَبْ" کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے اُس کے خالق کا تفصیلی تعارف پہنچانا ضروری ہے۔ کیونکہ شاعری شخصیت کا پرتو ہوتی ہے۔ "وشتِ شب" میں موجود شاعری بھی جاوید شیؔدا کی ذات اور شخصیت کا پرتو ہے۔ جس طرح

اور جس قدر جاوید شیداؔ خود ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہیں، اسی طرح اور اسی قدر اُن کی شاعری بھی ہمہ جہت ہے۔ جیسے جاوید شیداؔ چُست اور رواں طبع ہیں، ویسے ہی دشتِ شب کے مشمولات آسان، رواں، سلیس اور سہلِ ممتنع ہیں۔ خیالات نہائیت پُختہ اور ان کی بندشیں کسی مُشاق شاعر کے کمالِ فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جاوید شیداؔ نے اپنی شخصیت کے سارے روپ اور تمام تر پہلو اس میں یکجا کر دیئے ہیں اور یوں قاری کے لیے آسان کر دیا ہے۔ کہ وہ "دشتِ شب" پڑھ کے جاوید شیداؔ سے مل لے اور جاوید شیداؔ سے مل کر "دشتِ شب" پڑھ لے۔

رہی بات ناقدین کی، تو یہ اپنی رائے دینے میں خودمُختار ہوتے ہیں اور ان کے فیصلے اکثر غلط نہیں ہوتے اُمید ہے آنے والا وقت "دشتِ شب" کو پزیرائی دے گا۔

سعید قریشی

١٠-١١-٢٠١٠

تسمیعہ

’’درِ دِشَب‘‘ نے جیسے اک دشت میں لا کھڑا کیا، تنہائی سہم کر قلم سے لپٹ گئی، اور پھر...... مَن کا سناٹا اِس ’’دشتِ شَب‘‘ میں گونجنے لگا۔۔ پھر یوں ہُوا کہ کسی کی ایک نظر ایک ہی جست میں پار لگا گئی اور میں اپنی مُراد کو پہنچا۔ اب یہ نذر مجاب ہو جائے تو بھاگ بھری!

جاوید شیدؔا

حمد

اے خدا بتا کہاں نہیں ہے تُو
ہر طرف ہے تیرا رنگ تیری بُو

تو رسولِ خیر کا دُرود خواں
میری طرح عشق ہے تری بھی خو

چل رہی ہے آنکھ، دیکھتی نہیں
تیرا رنگ ہے ہوا میں ہُو بہ ہُو

کون اور ہے یہاں جو سُن سکے
آہ و نالہ و فغان و ہا و ہُو

تُو کہ بے مکان و بے نیاز ہے
تیرا عبد ہوں تمام آرزو

نعت

ہو جس کو میسّر ترا دیدار ہمیشہ
وہ ملکِ محبت کا ہے سردار ہمیشہ

مجھ جیسے گنہگار ہیں سرشار ہمیشہ
مائل بہ کرم رہتے ہیں سرکار ہمیشہ

یارب! مری آنکھوں کو یہ آداب سکھا دے
تا حشر رہیں فرشِ رہِ یار ہمیشہ

آجائے مجھے اُن سے تکلم کا قرینہ
ہے میری زباں اس کی طلبگار ہمیشہ

اَے کاش مجھے لوگ کہیں آپؐ کا شیدا
اور آپ کی جانب سے ہو اقرار ہمیشہ

سلام (بحضورِ امام شہدا)

سِبط شہ کون و مکاں تجھ پر سلام
تسکینِ دل تسکینِ جاں تُجھ پر سلام

ہر اِک نہاں تُجھ پر عیاں تجھ پر سلام
اے واقفِ سرِ نہاں تجھ پر سلام

اے بے اماںوں کی اماں تجھ پر سلام
اے غمگسارِ غمزداں تجھ پر سلام

مولا ترے دشمن رہیں محشر تلک
معدوم و بے نام و نشاں تجھ پر سلام

للہ رحمت کی نظر جاوید پر
اے بحرِ رحمت ہر زماں تجھ پر سلام

منقبت

(بحضور سیّد محمد وجیہ السیما عرفانی چشتی رحمتہ اللہ علیہ)

بنا ہے غم کے ماروں کا سہارا بابا عرفانؒی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؒی

گداؤں کو شہنشاہی عطا کرتا ہے عرفانؒی
ہر اک غم کی دوا سب کو دیا کرتا ہے عرفانؒی
کسی بیمار نے جب بھی پکارا بابا عرفانؒی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؒی

دعا تیری زباں سے جو نکل جائے وہ پوری ہو
ترے منگتوں کی کوئی آرزو کیونکر ادھوری ہو
بس اک چشمِ کرم ِللہ، خدارا بابا عرفانؒی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؒی

ترے دربار پر ہے نور کا سایہ سدا دیکھا
کرم اللہ کا یاں پر بنامِ مصطفےٰ دیکھا
یہاں پر بخت جاتا ہے سنوارا بابا عرفانؔی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؔی

وجیہ السیما عرفانؔی نمائندہ محمدؐ کا
ستارہ ہے سدا روشن درخشندہ محمدؐ کا
مدینے کا ہے یاں پر فیض سارا بابا عرفانؔی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؔی

سوالی دَر سے تیرے کوئی بھی خالی نہیں آیا
زمانے بھر کا ٹھکرایا ہوا آخر یہیں آیا
ترا شیدؔا بھی ہے دردوں کا مارا بابا عرفانؔی
نہیں کوئی تمہارے بن ہمارا بابا عرفانؔی

ماں

دھوپ جب سانپ بن کے ڈستی ہے
ابر کی طرح تو برستی ہے

تیرا آنچل حیا ہے مریم کی
تیرا دامن خدا کی بستی ہے

کوئی ثانی نہیں جہاں میں ترا
تیری ہستی عظیم ہستی ہے

کتنا اونچا ہے مرتبہ تیرا
اوجِ افلاک تیری پستی ہے

تو دکھائی نہ دے مجھے جب تک
آنکھ بینائی کو ترستی ہے

ماں کی عظمت کا کیا کہوں شیداؔ
اِس میں پنہاں خدا کی ہستی ہے



کوئی چراغ جلاؤ کہ شب نہیں کٹتی
غزل کا ساز اٹھاؤ کہ شب نہیں کٹتی

جو خواب سوئے ہیں مدّت سے میری آنکھوں میں
اُنھیں بھی آج جگاؤ کہ شب نہیں کٹتی

اگر خوشی کی کرن تک نہیں میسر تو
ہمارے غم کو بڑھاؤ کہ شب نہیں کٹتی

ہمارے دل کو ضرورت ہے روشنی کی بہت
اُس آفتاب کو لاؤ کہ شب نہیں کٹتی

بہت کٹھن تھے سبھی دن پہاڑ سے شیدؔا
بہانہ اب نہ بناؤ کہ شب نہیں کٹتی



سچے جذبے نے بھنور کو پانی پانی کر دیا
موج کو کچے گھڑے نے بے معانی کردیا

چل کے خود دار و رسن کی سمت اس منصور نے
موت کے مفہوم کو بھی زندگانی کر دیا

دھوپ جو اُتری ہوئی تھی زندگی کے دَشت میں
میری ہمّت نے اُسے بھی سائبانی کر دیا

ایسے بھی درویش دیکھے ہیں جنھوں نے دوستو
ذرہ ذرہ اِس زمیں کا آسمانی کر دیا

موت کی جانب رواں تھا زندگی کا قافلہ
چھو کے مجھ فانی کو اُس نے جاودانی کر دیا

میں ہوں شیدا دیکھنا اُس حُسن کی سرکار کا
چاند کو جلووں سے جس نے پانی پانی کر دیا



کیا کیا نہ زمانے میں ہوا کیا نہیں ہوتا
جیسا مجھے مطلوب ہے ویسا نہیں ہوتا

کر بیٹھے دل و جان فدا اُس پہ ولیکن
وہ شوخ کسی طور ہمارا نہیں ہوتا

مانا کہ تیرے قرب میں بھی جاں کا زیاں ہے
پر اِس کے بنا بھی تو گزارہ نہیں ہوتا

ہُوں گوش برآواز مگر خانۂ دل میں
ہوتا ہے مگر کوئی تماشا نہیں ہوتا

ہوتی ہے ضرور اُس میں کوئی بات وگرنہ
بے وجہ کسی کا کوئی شیدا نہیں ہوتا



شبِ فرقت وصال ہو جائے
زندگی بے مثال ہو جائے

کیسے ممکن ہے تیری فرقت میں
دل کی دھڑکن بحال ہوجائے

کیا قیامت ہے انتظار کا پل
عرصۂ ماہ و سال ہو جائے

وہ جو لوٹ آئے اِس خرابے میں
وحشتِ دل کمال ہو جائے

وار کرتا ہے جب فلک مجھ پر
یہ زمیں میری ڈھال ہو جائے



جب تیری تمنا میں کبھی خاک ہوئے ہم
دُنیا یہ سمجھتی تھی کہ افلاک ہوئے ہم

مہکا نہ کوئی پھُول سرِ شاخ محبت
سو بار ترا دامنِ صد چاک ہوئے ہم

کہتا ہے وہی آج ہمیں ننگِ زمانہ
جس کے لیے آئینہ وپوشاک ہوئے ہم

اِک روز اُسی آگ سے پھُوٹیں گے شگوفے
جس آگ کی خاطر خس وخاشاک ہوئے ہم

تھا مَیل گناہوں کا عجب شیداؔ بدن پر
جب خوں میں نہائے تو ذرا پاک ہوئے ہم



جان کسی پر وار آئے ہیں
سارا بوجھ اُتار آئے ہیں

ہجر کی رات گزار آئے ہیں
اِک دریا کے پار آئے ہیں

ہم سے تجھ کو نفرت تھی نا!
لو ہم خود کو مار آئے ہیں

جیت آئے تم جیت آئے ہو
ہار آئے، ہم ہار آئے ہیں

تیرے عاشق تیرے شیدا
تن مَن تجھ پر وار آئے ہیں



رنج کی گفتگو کِیا کیجے
تم کیا کیجے، تُو کِیا کیجے

شاید اُس کا کبھی پسیجے دل
گریہ و ہا و ہو کِیا کیجے

درد لازم ہے عاشقی کے لیے
درد کی آرزو کِیا کیجے

اُس کی چوکھٹ پہ حاضری کے لیے
آنسوؤں سے وضو کِیا کیجے

رنگ و بُو کائنات کا زیور
خواہشِ رنگ و بُو کِیا کیجے



جب ہم نے روشنی کو اِدھر سے اُدھر کیا
اِس تیرگیِ شب نے چراغوں میں در کیا

اِک یہ بھی کارِ خیر سرِ رہ گزر کیا
اک عمر پتھروں کو اِدھر سے اُدھر کیا

نکلے نہ پھر بھی قیدِ زمان و مکاں سے ہم
ہم نے سروں کے بل بھی برابر سفر کیا

ممکن ہے خود کو ڈھونڈ نکالوں کسی طرح
تجھ جیسا خود کو بس اسی امکان پر کیا

اک عمر مجھ میں دُھوپ کا صحرا اُتار کر
اِن موسموں نے شاخِ بدن کو شجر کیا

وہ لاش ہوں میں جس کو یہاں تک خبر نہیں
شیداؔ مری حیات کو کس نے بسر کیا



شبِ غم میں غضب اندھیرا ہے
تُو نہیں تو عجب اندھیرا ہے

بُجھ گیا مُجھ سے اتنا کہہ کے چراغ
روشنی کا سبب اندھیرا ہے

حرف تک کچھ دکھائی دیتا نہیں
کتنا سوئے ادب اندھیرا ہے

تم مِری آنکھ سے اگر دیکھو
کارِ دُنیا تو سب اندھیرا ہے

وہ بھی دن تھے سحر نُما تھا میں
میرے ہمراہ اب اندھیرا ہے

بے نیازی ہے کس قدر شیدؔا
کس قدر بے طلب اندھیرا ہے



آؤ غموں کی بات کریں ہم
بیتے دِنوں کی بات کریں ہم

آہوں کو سنگیت بنا کر
دردوں کو سوغات کریں ہم

تپتا صحرا راہِ محبت
اشکوں کی برسات کریں ہم

وقت کی باگیں ہاتھ میں لے کر
خود ہی دن کو رات کریں ہم

شیداؔ آؤ اب تو مل کر
بہتر کچھ حالات کریں ہم



خود سے جب عرضِ حال کرتے ہو
تم بھی کیا کیا کمال کرتے ہو

دل کا آئینہ کرچی کرچی ہُوا
خاک تم دیکھ بھال کرتے ہو

اپنی ہلکی سی مسکراہٹ سے
دھڑکنوں کو بحال کرتے ہو

جس کی ہوتی نہیں مثال کوئی
کام وہ بے مثال کرتے ہو

اِک نظر دیکھ کر محبت سے
کیا عجب اِشتعال کرتے ہو
اپنے شیدا کو اس محبت میں
کس لیے مستِ حال کرتے ہو



اُس کی چال غزالوں جیسی
اُس کی آنکھ عقابوں جیسی

گلشن گلشن پھیل رہی ہے
خوشبو تیری زلفوں جیسی

دھوپ میں سایہ بن جاتا ہوں
میری فطرت پیڑوں جیسی

ہوش حواس بُھلا دیتی ہے
راہ عشق خرابوں جیسی

اُس کا چہرے پھولوں جیسا
اُس کی آنکھیں. جھیلوں جیسی



عشق کہانی آہ پرانی
جتنی رکاوٹ اُتنی روانی

میرے لیے ہے قولِ فیصل
اُس کے لیے بات ہے زبانی

ایک وہی مانوس سا چہرہ
اک صورت جانی پہچانی

جیون اِک دشوار سفر ہے
عشق کی منزل مشکل پانی

عشق میں ہم نے اتنا سیکھا
عشق حقیقت زیست کہانی

بے رخیوں کی دُھند بہت ہے
شکل نہیں جاتی پہچانی

شیداؔ نام فدا ہونے کا
تو نے کیوں یہ بات نہ جانی



حُسن اُس کا ، جمال اُس کا ہے
کیف اُس کا، کمال اُس کا ہے

سونا اور جاگنا اُسی کا ہے
خواب اُس کا ، خیال اُس کا ہے

وقت سب اُس کی دسترس میں ہے
ماضی اُس کا ہے، حال اُس کا ہے

سارے کرب وطرب اُسی کے ہیں
سارا حُزن و ملال اُس کا ہے

وہ کہ مسئول بھی ہے سائل بھی
ہر جواب و سوال اُس کا ہے

دلِ رنجور کے سوا شیدؔا
جو بچا ہے وہ مال اُس کا ہے



جب وہ میرے ساتھ چلے
رنگوں کی بارات چلے

دل کی دھڑکن بول اُٹھے
جب بھی اُن کی بات چلے

اُن کی خوشبو کے ہمراہ
میری پُوری ذات چلے

اُن کی یاد میں دن گزرے
دن کے پیچھے رات چلے



وہ صورت روبرو رکھنا ہمیشہ
نظر کو باوضو رکھنا ہمیشہ

زباں پر ذکر اُس کا اور دل میں
اُسی کی آرزو رکھنا ہمیشہ

ازل سے اپنا شیوہ ہے لبوں پر
کسی کی گفتگو رکھنا ہمیشہ

سخی کی شان ہے ساقی سے کہہ دو
بھرے جام و سبُو رکھنا ہمیشہ

بحقِ احمدِ مرسل خدایا
ہماری آبرو رکھنا ہمیشہ

عقیدہ اہل دل کا ہے یہ شیدؔا
وفا کو سُرخُرو رکھنا ہمیشہ



دُشوار زندگانی کو آسان کر لیا
نقشِ قدم کو اُن کے جو ایمان کر لیا

جب اُن کے ہاتھ اپنے گریبان پر اُٹھے
سارا لباس ہم نے گریبان کر لیا

ہم نے بُجھا کے داغِ جگر اپنے ہاتھ سے
خود کو شبِ ستم میں پریشان کر لیا

حیران ہو گئے کبھی اُن کی جفاؤں پر
اُن کو کبھی وفاؤں سے حیران کر لیا

ہم نے رُخِ حیات کو اُس سمت موڑ کر
جینے کا شہرِ درد میں سامان کر لیا

زندہ رہوں گا میں تو اُجالوں کے ساتھ ساتھ
شیداؔ سحر کے ساتھ یہ پیمان کر لیا

○



جس قدر اب ہیں رابطے باہم
اسقدر تو کبھی نہ تھے باہم

بڑھتے جائیں گے فاصلے باہم
گر نہیں ہوں گے فیصلے باہم

حشر تک بھی نہ جُڑ سکیں شاید
ایسے ٹوٹے ہیں سلسلے باہم

جب چمن میں کوئی کلی چٹکی
رنگ و نکہت بچھڑ گئے باہم

شوقِ پرواز دل میں تھا شیدؔا
پر مرے پَر نہیں ہلے باہم



موت جب راس آ گئی ہے مجھے
زندگی پھر بلا رہی ہے مجھے

وصل کی آرزو بڑی ہے مجھے
اک اسی چیز کی کمی ہے مجھے

آنکھ برسے نہ کس لیے میری
دل میں اک آگ جو لگی ہے مجھے

میرے سینے میں یہ جو آتش ہے
یہ تمہاری ہی دی ہوئی ہے مجھے

اک تواتر سے اک تسلسل سے
اک صدا ہے جو آ رہی ہے مجھے

آگہی سے نجات چاہتا ہوں
آگہی اِک عذاب سی ہے مجھے

دیکھ کتنا ہوں صاحبِ ثروت
دولتِ درد مل گئی ہے مجھے



حسن قائم ہے مگر ذوقِ نظر کم کم ہے
لوگ بستے تو ہیں آباد نگر کم کم ہے

خلق موجود ہے اخلاق مگر کم کم ہے
وہ جو اسلاف میں تھا آج ہنر کم کم ہے

یہ سیہ رات خدا جانے کٹے گی کیسے؟
کہ اُفق تا بہ اُفق رنگِ سحر کم کم ہے

مرضِ عشق نہیں گھٹتا کسی صورت بھی
ہاں! دعا ہو کہ دوا، اب تو اثر کم کم ہے

عشق مجبور اور حسن مغرور نہ ہو
اِس کا امکان ہے امید مگر کم کم ہے



پتھر کو پگھلانے میں تو وقت لگے گا
اُس سے کچھ منوانے میں تو وقت لگے گا

ہم جس محفل سے اُٹھے تھے آسانی سے
اُس میں واپس جانے میں تو وقت لگے گا

خُلد سے ہم کو اک غلطی لے آئی تو تھی
پر اب خلد کو جانے میں تو وقت لگے گا

کہنے کو تو پل بھر میں جو کہہ ڈالی تھی
وہ بپتا دہرانے میں تو وقت لگے گا

اب دھیرے دھیرے پاگل ہونے والے کو
دانش مند بنانے میں تو وقت لگے گا

میں کیسے اس کو پل دو پل میں کہہ ڈالوں
ہجر کا قصہ سنانے میں تو وقت لگے گا

شیداؔ تیری فطرت میں نسیان بہت ہے
تجھ کو یاد دلانے میں تو وقت لگے گا



میں نے تعلقات نبھائے تمام عمر
لیکن وہ میرے کام نہ آئے تمام عمر

یوں تو رہِ وفا میں بہت دور تک گئے
منزل کے کچھ نشان نہ پائے تمام عمر

وہ ضبط ہے، مثال بھی جس کی محال ہے
لَب تک شکائتیں نہیں لائے تمام عمر

اے دوست صرف تیری تسلی کے واسطے
تیرے ہر اِک فریب میں آئے تمام عمر

دل میں تری طلب رہی، لب پر ترا ہی ذکر
پر تجھ کو تجھ سے مانگ نہ پائے تمام عمر

وہ وسوسے جو تیری طرف سے تھے ذہن میں
وہ وسوسے نِکل نہیں پائے تمام عمر

شیدا نہیں وہ اہلِ وفا، یہ یقین ہے
کرتے ہیں جو کہ گریہ و ہائے تمام عمر



میں تری داد کا تمنائی
میں تماشا ہوں تو تماشائی

میری چاہت ہی میں کمی ہوگی
ورنہ تُو تو نہیں ہے ہرجائی

مجھ کو وہ جرم ہی نہیں معلوم
جس خطا کی ہے یہ سزا پائی

چاند تاروں نے آپ سے سیکھی
سرِ افلاک بزم آرائی

میں کچھ ایسا ہوں بدنصیب جسے
زندگی بھر وفا نہ راس آئی

دیکھ لے تیری آرزو مجھ کو
پھر کہاں سے کہاں پہ لے آئی

میں ہی تنہا نہیں ترا شیدا
ایک عالم ہے تیرا شیدائی



تیرا حُسن جمالی ہے
میرا عشق جلالی ہے

حبس بڑھا ہی جاتا ہے
آندھی آنے والی ہے

وہ دل بھی کیا دل ہے جو
تیری یاد سے خالی ہے

جس نے باغ اُجاڑا ہے
وہ ہی باغ کا مالی ہے

ہر قصہ افسانہ ہے
ہر تصویر خیالی ہے

بس تصویروں میں شیدؔا
باقی اب ہریالی ہے



تیرے آنے سے یہاں ہے مجھے جینا آتا
تیرے جانے سے ہے ساون کا مہینا آتا

موج در موج مری زیست کی ناؤ بہتی
گر نہ ہر لمحہ مجھے یاد سفینہ آتا

تیرے بن جینا تو مشکل تھا مگر
مر ہی جاتے یہ اگر زہر نہ پینا آتا

اپنے اندر ہی سے پاتا میں نگینے کی ضیا
میرے حصے میں اگر کوئی دفینہ آتا

بات کرنے کا سلیقہ چلو اِک ہنر سہی
تیرے شیدؔا کو نہیں ہونٹوں کو سینا آتا



لفظ جب سے لکھا محبت کا
راز مجھ پر کھلا حقیقت کا

پھول مہکے ہیں ہنس رہی ہے فضا
یہ کوئی وقت ہے شکایت کا

لاکھ صدیوں پہ ہے محیط اے دوست
ایک لمحہ تری رفاقت کا

میں نے دیکھا ہے چاند کو اکثر
عکس پڑتا ہے تیری صورت کا

کتنا جاں سوز تھا میں کیسے کہوں
ایک اک پل تمہاری فرقت کا

روشنی کس سے مانگتے شیدؔا
ہر بشر ہے شکار ظلمت کا



ہاتھ ہیں تو بھنور سے کیا شکوہ
ساحلِ بے اثر سے کیا شکوہ

آمدِ شب کے خوف سے چپ ہوں
ورنہ مجھ کو سحر سے کیا شکوہ

جی رہا ہوں ترے بھروسے پر
مجھ کو تیری نظر سے کیا شکوہ

جو بھی چاہا وہی بنا ڈالا
اپنے دستِ ہُنر سے کیا شکوہ

میرا اپنا ہے، ہے یہ جیسا بھی
گھر میں رہتا ہوں گھر سے کیا شکوہ

منزلیں جب نہیں مقدّر میں
مجھ کو میرِ سفر سے کیا شکوہ

کھا گئی دھوپ جس کے سائے کو
شیدؔا ایسے شجر سے کیا شکوہ



فضا کے لبوں میں جو چُپ کی زباں ہے
جو سمجھو تو یہ اک طرح کی اذاں ہے

اُسے ڈھونڈتے جب نظر تھک چکی تو
یہ دل بول اُٹھا یہاں ہے یہاں ہے

مری بات کا تم بُرا مت منانا
مجھے بولنے کا سلیقہ کہاں ہے

سمجھ سے مری بالا تر ہے یہ نکتہ
نظر مطمئن ہے یہ دل بد گماں ہے

کسی کے بھرم کو ہے خاموش شیدؔا
دگرنہ مرے منہ میں بھی اک زباں ہے



جب سے مقدّروں کا ستارہ بدل گیا
خوش رنگ زندگی کا نظارہ بدل گیا

اُمواج نے جونہی مری کشتی کو آ لیا
ساحل کو جب پکارا کنارہ بدل گیا

دیکھا جو آئنہ تو خدوخال کھو گئے
خود کو چھُوا تو جسم ہی سارا بدل گیا

جب مجھ کو دوستوں کی ضرورت تھی اُس گھڑی
جِس کو بھی دی صدا وہ سہارا بدل گیا

آیا نہ راس مجھ کو چمن میں کوئی بھی پھُول
اُٹھی جدھر بھی آنکھ نظارہ بدل گیا

شیداؔ میں روشنی کی طَلب میں تھا در بدر
سُورج کے ساتھ ساتھ ستارہ بدل گیا



اُس شخص کو بس ایک نظر دیکھنے کے بعد
دیکھا نہ اور کچھ بھی اُدھر دیکھنے کے بعد

دشتِ بلا میں جسم کا سایہ پہن لیا
دھوپوں میں ہم نے ضبطِ شجر دیکھنے کے بعد

پھر کوئی حُسن آنکھ میں ٹھہرا نہیں کبھی
ظُلمت میں خوابِ حُسنِ سحر دیکھنے کے بعد

ڈھالا ہے خود کو ساحلِ ہستی کے رُوپ میں
سینے میں کوئی موجِ نظر دیکھنے کے بعد

شیداؔ چمک اُٹھے ہیں درو بامِ آرزو
اُس آفتابِ حشر کو گھر دیکھنے کے بعد



نقش و نگارِ زیست جو درکار ہو گئے
ہم لوگ آئنوں کے طرفدار ہو گئے

لو آج سر کو دَشنہ و خنجر پہ رکھ دیا
لو آج ہم بھی صاحبِ دستار ہو گئے

جب بھی عدو کے ہاتھ بڑھے گلستاں کی سمت
اپنے تمام لفظ ہی تلوار ہو گئے

سینچا ہر ایک پھول کو اپنے لہو کے ساتھ
شاخِ چمن کے واسطے مہکار ہو گئے

طوفانِ ظلم و جبر اگر یاد آ گیا
ہم تھے جو اُس کے سامنے دیوار ہو گئے

شیداؔ یہ زندگی کا تقاضا تھا اس لیے
ہم ہر نفس پہ صاحبِ کردار ہو گئے

○



اک عمر سے دامانِ تمنا میں لیے خاک
دیکھا نہ کبھی ایک نظر جانب افلاک

ہر شخص کو ملتی نہیں بینائی بھری آنکھ
ہر شخص کو ہوتا ہے کہاں حُسن کا اِدارک

دُنیا ہی بدل دی مری احساسِ خطا نے
اک اشکِ ندامت سے ہُوا میرا بدن پاک

نازاں ہے مُقدّر پہ جہاں جس کے سبب سے
آیا نہ ہمیں راس وہی لمحۂ چالاک

دُشوار ہُوا جب بھی طبیعت کا سنبھلنا
سینے سے لگائی، کبھی چہرے پہ ملی خاک

میں شامِ غریباں سے پلٹ آیا ہوں شیدؔا
خُوں رنگ مگر آج بھی ہے دیدۂ اِدراک



خاک سے جب تُو لو لگائے گا
آسمانوں کے راز پائے گا

اُلٹے گا جب نقاب صدیوں کے
پھر خبر دو جہاں کی پائے گا

دیکھ جا کر مکینِ دل تک تُو
لامکاں تک بھی پھر تُو جائے گا

خار و خس سے تُو دوستی کر لے
پھول کی طرح مُسکرائے گا

روشنی پھیل جائے گی ہر سُو
من کا جب دیپ جگمگائے گا

زندگانی کے اِس خرابے میں
بن ترے کون آئے جائے گا

زخم سہنے کا تُو سلیقہ سیکھ
غم میں شیدؔا سکُون پائے گا



ہمسفر جب سے تُو مرا نہ رہا
میرے قدموں میں راستہ نہ رہا

جب سے گھیرا بُرے دنوں نے مُجھے
آشنا بھی اب آشنا نہ رہا

میں ہوں ظلمت کے اُس اندھیرے میں
جہاں سُورج چراغ سا نہ رہا

آنکھ سے آنکھ بھی نہیں ملتی
دل سے دل کا بھی رابطہ نہ رہا

دیکھ کر طور اِس زمانے کے
زندہ رہنے کا حوصلہ نہ رہا

جب حقیقت تک آگیا شیدؔا
کوئی دل میں ترے سوا نہ رہا

○



جب دیا آرزو کا جلتا ہے
ہر نفس اک دھواں نکلتا ہے

روز اُترتی ہے دھوپ بالوں میں
سایۂ عمر روز ڈھلتا ہے

ہمسفر ہو نہ رہنما ہو جب
کون ایسے میں پھر سنبھلتا ہے

وہ گھڑی کم نہیں قیامت سے
رنگ جب اپنا خوں بدلتا ہے

اب کہاں بچپنا زمانے میں
رنج پر کون اب مچلتا ہے

دل بھی شیدا عجیب پاگل ہے
لاکھ سمجھاؤ کب سنبھلتا ہے



عہدِ کم ظرف میں دُہائی کا نام
اور رکھ لیں چلو جُدائی کا نام

زخم ہیں دل پہ جتنے فرقت کے
اُن کو دیتے ہیں ہم رہائی کا نام

ہم ہی بدلیں گے طور دُنیا کے
ہم ہی بدلیں گے اس خُدائی کا نام

رکھ لیا اور ہی زمانے نے
تیری اور میری آشنائی کا نام

باعثِ افتخار ٹھہرا ہے
کس قدر آج جگ ہنسائی کا نام

بخش دے مجھ کو یہ جہاں شیدآ
میں نہ اب لُوں گا پارسائی کا نام

○



لفظ کو یوں زبان میں رکھنا
تیر جیسے کمان میں رکھنا

خود کڑی دھوپ میں کھڑے رہنا
اور اُسے سائبان میں رکھنا

پھول کچھ ہار میں پرو لینا
اور کچھ پھول دان میں رکھنا

میرے اللہ! میرے دشمن کو
اپنی حفظ و امان میں رکھنا

کوئی پکوان ایک میٹھا بھی
اپنی اونچی دکان میں رکھنا

حسن کی یہ پرانی عادت ہے
عشق کو امتحان میں رکھنا

جو بھی حالات ہوں مگر شیداؔ
میری الفت بھی دھیان میں رکھنا



مذہب عشق اختیار کرو
جس کو دل چاہے اُس کو پیار کرو

اپنی کوشش پہ اعتبار کرو
دوسروں پر نہ انحصار کرو

صرف اپنے قرار کی خاطر
دوسروں کو نہ بے قرار کرو

دشمنی نفرتوں سے ہوتی ہے
دوستی اپنی استوار کرو

زیرِ پا منزلِ مراد ہے پھر
سیدھا رستہ ہی اختیار کرو

عیب گنتے ہو جس کے تم شیدآ
اُس کی کچھ خوبیاں شمار کرو



یہ مجھ میں رنگِ حقیقت ترے سبب سے ہے
یہ میری بُو مری نکہت ترے سبب سے ہے

اُداس اُداس فضائیں مرے سبب سے ہیں
گلوں میں رنگ و نزاکت ترے سبب سے ہے

مرے خیال کو دی تُو نے طاقتِ پرواز
مرے شعور کی رفعت ترے سبب سے ہے

مری جبین ترے سنگِ در پہ بجتی ہے
یہ میرا ذوقِ عبادت ترے سبب سے ہے

مجھے جو تجھ سے محبت ہے اُس کا ذکر ہی کیا
مجھے تو خود سے محبت ترے سبب سے ہے

مرا وجود، مرے خدوخال تو ہی تو ہے
مری یہ شکل و شباہت ترے سبب سے ہے

ترے سبب سے زمانے میں معتبر ہوں میں
یہ میرا نام، یہ عزت، ترے سبب سے ہے

ترے سبب سے ہے، سب کچھ ترے سبب سے ہے
یہی ہے اصل حقیقت ترے سبب سے ہے

ترے بغیر مجھے کون جانتا ہے یہاں
یہ چار سُو مری شہرت ترے سبب سے ہے



جو تیرے لیے دھول ہوئے خاک ہوئے ہیں
دراصل وہی لوگ ہی افلاک ہوئے ہیں

دیتا ہے یہاں کون حقیقت کی گواہی
سو بار حقیقت کے بدن چاک ہوئے ہیں

اب حُسن ترا میری نگاہوں میں نہیں ہے
بے رنگ تری زلف کے پیچاک ہوئے ہیں

پھرتا ہے یہاں ہر کوئی اپنے ہی جنوں میں
کم کم ہیں کہ جو صاحبِ ادراک ہوئے ہیں

وہ جن کو کبھی پھول میسّر نہیں آئے
اظہار کے کانٹوں کی وہ پوشاک ہوئے ہیں

غم ہے کہ ٹھہرتا ہی نہیں ہے کسی صورت
نالے ہیں کہ کچھ اور بھی بے باک ہوئے ہیں

اب وصل کی صورت کوئی حاصل نہیں شیدؔا
جس دن سے تری یاد میں غمناک ہوئے ہیں



دل ایسی شے کو ترے راستے پہ ڈالا ہے
مرا جہاں میں یہی معتبر حوالہ ہے

میں اپنی ذات سے انکار کرنے والا تھا
دیے کی لو نے مجھے رات بھر سنبھالا ہے

زمین ہے کہ مرے پاؤں چھوڑتی ہی نہیں
فلک کی سمت ہوا نے بہت اُچھالا ہے

ہم ایسا بے سر و ساماں بھی کوئی کیا ہوگا
کہ سر میں خاک نہ پیروں میں کوئی چھالا ہے

یہ کون صاحبِ عرفان ہو گیا شیدؔا
یہ کیسا دامنِ اُمیّد میں اُجالا ہے



شبِ غم کو اُجال رکھا ہے
ایک جگنو سنبھال رکھا ہے

گردشِ وقت کو تری خاطر
ایک مُدّت سے ٹال رکھا ہے

اس محبت نے کتنے سالوں سے
اک اذیّت میں ڈال رکھا ہے

جو قدم تیری یاد میں اُٹھے
نام اُس کا دھمال رکھا ہے

یوں کھٹکتا ہے ایک اک ارماں
جیسے سانپوں کو پال رکھا ہے

ایک مدّت سے دل کو سینے سے
ہم نے شیداؔ نکال رکھا ہے



ایسے ہندسے کی ہے تلاش مجھے
میری ہستی کو جو صفر کر دے

سفرِ زیست اب کٹے ایسے
میرا محبوب ہم سفر کر دے

فرقت ایسی نصیب ہو جو مجھے
ساری دُنیا سے بے خبر کر دے

ساز اور سوز ہوں بہم ایسے
سوز کے ساز مستقر کر دے

میں ہوں ایسی نگاہ کا شیدا
جو نظر کو مری نظر کر دے



چمن کی سیر کو آؤ بہار کے دن ہیں
خزاں کو بھول بھی جاؤ بہار کے دن ہیں

یہ دل اداس ہے صدیوں کے ہجر کا مارا
ذرا قریب تو آؤ بہار کے دن ہیں

یہ التماس ہے نکلو اداس لمحوں سے
کلامِ تازہ سناؤ بہار کے دن ہیں

کسی کے حُسن کی رنگینیوں میں گم ہو کر
پرانے درد بھلاؤ بہار کے دن ہیں

پھر آج چھیڑ کے ملہار راگ کو شیدؔا
فضا کو مست بناؤ بہار کے دن ہیں



ہے اگر ذوقِ طرَب جشن بہاراں میں چلو
ذوق کی تسکین کو تم بزمِ یاراں میں چلو

حُسن میں بے مثل ہو تم، رنگ میں ہو خوب تر
میں تمہیں پہچان لوں گا گو ہزاراں میں چلو

موسم گل ہے چمن میں پُھول کلیوں میں رہو
حُسنِ بے پروا کی پریوں کی قطاراں میں چلو

موت بے معنی سی لگتی ہے حضوری کے بغیر
زندگی کے دائرِوں میں اور حصاراں میں چلو

ہاتھ ہے شیدؔا ترا اسپِ رواں کی باگ پر
شان سے بیٹھو اور اب تم شہ سواراں میں چلو



میں جب بھی کبھی گزرا تری راہ گزر سے
ہر بار ہوں ٹوٹا کسی انجانے سے ڈر سے

دل چیز ہے کیا جان بھی میں اُس پہ لُٹا دوں
اِک بار وہ دیکھے تو محبت کی نظر سے

سایہ تھا مرے سر پہ مری ماں کی دُعا کا
لوٹا ہوں سلامت جو میں اُس دھوپ نگر سے

سو بار ہوں اِس کوشش پیہم سے میں گزرا
باہر نہ نکل پایا مگر شام و سحر سے

اِک آس کا دامن مرے ہاتھوں میں رہا ہے
جب تک رہا مایوس محبت میں اُدھر سے

وہ آگ لگی شہر وفا کیش میں شیدؔا
بُجھ پائی نہ، بادل بھی یہاں سینکڑوں برسے



آنکھ سے سب گزر کے جاتا ہے
وقت خود ہی ادھر کو آتا ہے

رہتی ہے یہ ہوا تعاقب میں
کہ دیا کس کے در کو جاتا ہے

سب ہی گوشہ نشینی چاہتے ہیں
کون دُنیا کی زد میں آتا ہے

آئنہ ہے اساسِ اہلِ نظر
چہرہ ہر ہر نظر میں آتا ہے

ہے نکلتا، فریبِ رنگ سے شہر
سعد جو دیپ جب جلاتا ہے

ہار آئے جو تیرے در پہ کوئی
وہ خزانہ جہاں کا پاتا ہے

تُو نے جو بھی کہا یہاں شیدؔا
اجر اہلِ سخن کو جاتا ہے



شبِ ستم سے ذرا روشنی نکلتے ہی
بدل گئے سبھی موسم ، چراغ جلتے ہی

مِلا نہ کوئی نشاں مجھ کو اپنے ہونے کا
میں خُود بھی ڈھل گیا سایہ بدن کا ڈھلتے ہی

ہزاروں مِیل ہوئیں دُور منزلیں مجھ سے
رہِ طلب میں کوئی ہمسفر بدلتے ہی

نہ جانے کون سے لمحے میں جی رہا تھا میں
میں ڈگمگانے لگا وقت کے سنبھلتے ہی

عجیب ہونے لگی کیفیت مِرے دل کی
عجیب آگ سی بھڑکی نظر مچلتے ہی

اداسی گھیرنے لگتی ہے پھر مجھے شیدؔا
مِری اُداس طبیعت ذرا سنبھلتے ہی



ایسا بھی اِک ستارہ سرِ آسمان تھا
جس پر جہاں کو حُسنِ سحر کا گمان تھا

میرے تمام نقش اُسی نے اُلٹ دیے
وہ آئنہ جو مجھ پہ بڑا مہربان تھا

رنگ اور مہک تھے سانس میں سرسبز تھی حیات
جب تک میں اپنے آپ میں اک خاکدان تھا

اک عمر میرے سائے میں بیٹھا ہے یہ جہاں
میں بھی کبھی فلک کی طرح سائبان تھا

اب تو بدل گیا ہوں میں مٹی کے ڈھیر میں
جب تک وہ میرے ساتھ تھا میں اک چٹان تھا

شیدا مجھے تو رزقِ زمیں نے کیا ہے پست
میں ورنہ اپنی ذات میں اک آسمان تھا

○



ہمارے پاس ہے جو کچھ بھی وہ ہمارا نہیں
ترے بغیر زمانے میں کچھ گوارا نہیں

پڑی ہے جب کوئی افتاد ایک تیرے سوا
کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارا نہیں

اے آسمانِ طلب تُجھ کو کچھ خبر بھی ہے
اک آبلہ ہے ہتھیلی مِری، ستارہ نہیں

تجھے بھی مُجھ سے شکایت ہے بے وفائی کی
ترے بغیر تو اک سانس بھی گزارا نہیں

اِس اشکِ غم کی روانی کا کیا کہوں شیداؔ
یہ ایسی موج ہے جس کا کوئی کنارا نہیں



ہر نفَس جلتی بجھتی حسرت ہے
زندگی دھُوپ کی تمازت ہے

ایسا بدلا ہے کاروبارِ جہاں
کارِ مجنوں بھی اب تجارت ہے

زندگی کا نہیں یقیں کچھ بھی
موت سب سے بڑی حقیقت ہے

ایک پتھر کو ہم نوا سمجھا
آئنے سے یہی شکایت ہے

جو کسی طور سر نہیں ہوتا
زندگی ایک ایسا پربت ہے

اُس کی فرقت میں جی رہا ہوں میں
ہر نفس مُجھ کو بس یہ حیرت ہے



جیسے بُجھتے چراغ کی لو ہے
میرے دل کے چراغ کی لو ہے

منزلوں تک ہے روشنی جس کی
کیا خبر کس سراغ کی لو ہے

مُجھ پہ اَسرارِ دوجہاں کھولے
یہ جو میرے دماغ کی لو ہے

غنچہ غنچہ ہے ضو فشاں جس سے
میرے اندر کے باغ کی لو ہے

عکس جس کا ہے پانیوں میں عیاں
ایک ٹُوٹے ایاغ کی لو ہے

کارِ دنیا کو جس نے بخشی نظر
شیدؔا میرے فراغ کی لو ہے



گو پیار کا اب کوئی بھی امکان نہیں ہے
اِس پر بھی کوئی شخص پریشان نہیں ہے

میں کون ہوں، کس واسطے آیا ہوں جہاں میں
مُجھ کو بھی مِری ذات کی پہچان نہیں ہے

دیکھا ہے جِسے میں نے نظر آیا ادھُورا
اب کوئی مکمل یہاں انسان نہیں ہے

ہے کون سی رہ کون سی منزل ہے ہماری
اِس بات کا بھی ہم کو کوئی دھیان نہیں ہے

ٹوٹے ہیں سبھی خنجر و پیکان ہمارے
اب فتح کا اپنی کوئی اِمکان نہیں ہے

ٹھہرا ہوں میں اب ایسی تمنا کے مقابل
جو دل کے دھڑکنے پہ بھی حیران نہیں ہے



ظلمتِ شب میں روشنی کیا ہے
مُجھ سے پُوچھو کہ تیرگی کیا ہے

ایک جیسے ہیں پھُول اور کانٹے
موت کیا شے ہے زندگی کیا ہے

ہر تمنا اگر ادھوری ہے
لبِ دُنیا پہ یہ ہنسی کیا ہے

جان پایا نہ زندگی بھر میں
درد کیا چیز ہے خوشی کیا ہے

سو گیا ہے مِرا نصیب اگر
نیند آنکھوں میں جاگتی کیا ہے

کوئی پُوچھے تو میں بتاؤں بھی
آنے والی بھلا صدی کیا ہے



جب سے مٹی کے پیرہن میں ہے
اِک مہک سی مِرے بدن میں ہے

پھُول ماتم کُناں ہیں شاخوں پر
ہر کلی غمزدہ چمن میں ہے

دھڑکنیں ہو رہی ہیں بے ترتیب
اِس برس دل عجب گھُٹن میں ہے

سہمی سہمی ہے زندگی ڈر سے
موت رقصاں مِرے وطن میں ہے

کیا غرض سر پھری ہواؤں کو
آخری دیپ انجُمن میں ہے

کون گُزرا ادھر سے اے شیدؔا
کیسی خوشبو سی دل کے بَن میں ہے



دُشوار کِس قدر ہے گزرگاہِ زندگی
تُجھ بِن تو اک کھنڈر ہے گزرگاہِ زندگی

ڈھونڈو ہزار کوئی بھی سایہ کہیں نہیں
اک جلتی دوپہر ہے گزرگاہِ زندگی

گزرا ہے کون کون یہاں سے بہ حالِ غم
ہر لحظہ بے خبر ہے گزرگاہِ زندگی

نکلے تھے اک طویل سفر پر ازل سے ہم
دیکھا تو مختصر ہے گزرگاہِ زندگی

تیری طرح کا ایک بھی چہرہ نہیں ملا
بے رنگ سر بہ سر ہے گزرگاہِ زندگی

شیدؔا کھُلا ہے سانس کے اِس اضطراب سے
اک کارِ بے ثمر ہے گزر گاہِ زندگی



جب چراغِ دل و نظر بھی تھا
میں شبِ غم میں معتبر بھی تھا

میرا سایہ تھا مہرباں مجھ پر
میرے ہمراہ اک شجر بھی تھا

ہر نَفَس منتشر رہا پھر بھی
زندگی کا مُجھے ہُنر بھی تھا

جب تھی دستار میرے پیشِ نظر
میرے شانوں پہ میرا سر بھی تھا

خود کو پانے کی جُستجو بھی تھی
تیری خواہش میں در بدر بھی تھا

تب بھی پہنچی نہ آسمانوں پر
جب مری آہ میں اثر بھی تھا

جب وہ دل میں مکین تھا شیداؔ
یہ کھنڈر اُن دنوں میں گھر بھی تھا



اُس کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
سنگ کو آزما کے دیکھ لیا

کسی جانب سے کچھ صدا نہ اُٹھی
آئنے کو گرا کے دیکھ لیا

ہونٹ کُھلتے نہیں دُعا کے لیے
ہاتھ ہم نے اُٹھا کے دیکھ لیا

کام میرے کوئی نہیں آیا
خود کو بھی آزما کے دیکھ لیا

ہو نہ جاؤں کہیں میں پتھر کا
خود کو ٹھوکر لگا کے دیکھ لیا

کیوں اُجالا نہیں مُقدر میں
ہر گھڑی جگمگا کے دیکھ لیا



جب عکسِ ماہتاب نظر میں ٹھہر گیا
میں زندگی کی راہ گزر میں ٹھہر گیا

سورج نے جتنے ابر تھے سب کو جلا دیا
دھُوپوں کا اضطراب شجر میں ٹھہر گیا

جتنی بھی راکھ تھی مری آنکھوں میں آپڑی
آنسو تری طلب کا شرر میں ٹھہر گیا

موجِ نَفَس میں ایسی روانی بلا کی ہے
دریا سمٹ کے جیسے بھنور میں ٹھہر گیا

کچھ ایسے چیختے ہیں درو بامِ آرزُو
آسیب جیسے زیست کے گھر میں ٹھہر گیا

اعصاب شل ہوئے مِرے شیدؔا تمام ہی
سودا یہ اب کے کیا مِرے سر میں ٹھہر گیا



میں تھا جس رہ گزر پہ دھُوپ رہی
عمر بھر میرے سر پہ دھُوپ رہی

اِس لیے کچھ نہ دیکھ پایا میں
ہر نظر پر نظر پہ دھُوپ رہی

ابر برسا جہاں، نہیں تھا میں
میں جہاں تھا نگر پہ دھُوپ رہی

جس میں رکھا تھا جسم کا سایہ
عمر بھر اُس شجر پہ دھُوپ رہی

جب تلک میں رہا ہوں صاحبِ فن
میرے دستِ ہُنر پہ دھُوپ رہی

رقص کرتی ہوئی مِرے ہمراہ
ہر قدم رہ گزر پہ دھوپ رہی

میرے آنگن میں چھاؤں تھی شیدا
اور مِرے بام و در پہ دھُوپ رہی



اگرچہ لاکھ میں خوش رنگ پیرہن میں رہا
تمہارا درد ہمیشہ مِرے بدن میں رہا

تری تلاش میں اُتری تھی جو رگ و پے میں
تمام عمر میں رستوں کی اس تھکن میں رہا

کبھی زمیں پہ جلا ہوں چراغ کی صورت
میں آفتاب کی صورت کبھی گگن میں رہا

میں کیا بتاؤں شکستِ حیات کیا شے ہے
مِرا لباس ہی شامل مِرے کفن میں رہا

دیارِ ظلمتِ شب میں جسے اُترنا تھا
میں انتظار کی صورت اُسی کرن میں رہا

اُسے بھی بادِ خزاں مجھ سے لے اُڑی شیدؔا
جو پھول بن کے مِری زندگی کے بن میں رہا



فلک کی طرح مُجھے بھی بُلند ہونا تھا
اور اس سے پہلے تمہاری پسند ہونا تھا

خود اپنے آپ کی تسخیر مُجھ کو کرنا تھی
خود اپنے آپ کی خاطر کمند ہونا تھا

تمہارے چہرے پہ آ کر ٹھہر گئی ہوتی
کِسی نظر کو اگر سود مند ہونا تھا

عبور کرنا تھا اک جَست میں یہ ذات کا دشت
کِسی غزال کی مُجھ کو زقند ہونا تھا

رہا نہ اتنا بھی غفلت میں یاد اے شیداؔ!
درِ دُعا تو کسی روز بند ہونا تھا



جن دِنوں خود پہ مہرباں تھا میں
صورتِ مہر ضو فشاں تھا میں

جس گھڑی مُجھ کو تھی تلاش اپنی
اپنی ہی ذات میں کہاں تھا میں

جب تلک میں رہا کناروں میں
موج در موج کیا رواں تھا میں

تُو نے مُجھ کو مِٹا کے دیکھ لیا!
تیری ہستی کا اک نشاں تھا میں

تم نے جتنا سمجھ لیا مُجھ کو
اُتنا دُشوار بھی کہاں تھا میں

ایک جھونکے کی مثل تھا شیدؔا
اور پھِر وقفِ دو جہاں تھا میں



ہیں جس کے تذکرے اُس آسماں پر
میں ایسا حرف ہُوں لوحِ جہاں پر

کوئی پیغام بھیجو آندھیوں کو
میں موجِ عکس ہوں ریگِ رواں پر

کہاں ہوں میں اکیلا ہی پریشاں
پریشاں ہے جسے دیکھو یہاں پر

عجب اک خوف سا چھایا ہُوا ہے
تمہارے بعد اس میرے مکاں پر

اجل کی سمت ہوں شیدا سفر میں
سواری کر کے میں عمرِ رواں پر



اِس دردِ جُدائی سے بھی انجان نہیں میں
قسمت پہ مگر اپنی تو حیران نہیں میں

گو توڑ دیے تم نے بھروسے مِرے سارے
اِس تیرے رویے پہ تو حیران نہیں میں

اک وقت تھا جب مُجھ سے تھی پہچان جہاں کی
اور آج یہاں اپنی بھی پہچان نہیں میں

ٹُوٹے گا کسی طور تو یہ پیار کا بندھن
دھاگے کی طرح پیار کا پیمان نہیں میں

انساں کا بدن جس سے سُلگ اُٹھتا ہے شیدا
سینے میں وہ جلتا ہُوا ارمان نہیں میں



سینے کی اے گھُٹن لبِ اظہار تک چلیں
سائے کی جُستجو میں ذرا دار تک چلیں

ممکن جو ہو سکے تو ذرا دیر کے لیے
خود سے نِکل کے کوچہء دلدار تک چلیں

اِس کے بغیر دھوپ سے بچنا محال ہے
جیسے بھی اب ہو سایہء دیوار تک چلیں

دامن میں کچھ نہیں ہے سوائے خلوص کے
چلنے کو ہم بھی دوستو بازار تک چلیں



خنجر لیے ہوئے کبھی تیر و کماں لیے
کیا کیا نہ اِس حیات نے ہیں امتحاں لیے

جھلسا رہی ہے دھُوپ مِرا جسم ہر گھڑی
پھرتا ہوں اپنے سر پہ مگر آسماں لیے

مُجھ کو جہاں سے ایک کرن بھی نہ مل سکی
پہنچا ہوں اُس مقام پہ میں کہکشاں لیے

ٹُوٹا کہاں کہاں نہ بھرم میری ذات کا
پہنچی کہاں کہاں نہ ہوا داستاں لیے

شؔیدا میں پھر رہا ہوں شبِ بے چراغ میں
ہمراہ رنگ و نور کا اپنے جہاں لیے



بے شجر رہ گزار ہونے سے
کیا ملا ہے غبار ہونے سے

اک عجب سا سکوں ملتا ہے
اب مُجھے بیقرار ہونے سے

جانے کیوں رو پڑے ہیں لالہ و گل
گُلستاں میں بہار ہونے سے

شدتِ انتظار بڑھتی رہی
ہر نظر انتظار ہونے سے

کِس قدر ہو گیا ہوں میں رُسوا
شہر میں نامدار ہونے سے

کتنا بے اختیار ہوں شیدؔا
آج با اختیار ہونے سے



داستانِ دل کسی صُورت سُنا کر دیکھتے
کاش اس ظالم کو ہم بھی آزما کر دیکھتے

روک کر ہم بھی کسی دن اشکِ غم کو آنکھ میں
ایک دو پل ہی سہی اُس کو رُلا کر دیکھتے

داغِ فرقت بھی نہ ہم کو راس آیا دوستو
ورنہ ہم اس تیرگی میں جگمگا کر دیکھتے

یہ بھی ممکن تھا خُوشی بیدار ہو جاتی کوئی
خود کو راہِ درد میں ٹھوکر لگا کر دیکھتے

دی نہ مہلت اِس قدر بھی اِس زمانے نے ہمیں
پیار کے نغمات شیدؔا گنگنا کر دیکھتے



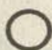
میں کہ فطرت میں داغ جیسا ہوں
یعنی خالی ایاغ جیسا ہوں

جلتا رہتا ہوں دردِ فرقت میں
میں سراپا چراغ جیسا ہوں

تُجھ کو پانا ہے اس خرابے میں
راستے میں سراغ جیسا ہوں

تیری قُربت میں ہر نَفَس جیسے
میں کہ جنت کے باغ جیسا ہوں

دل کی اُلجھن میں دل کی صورت ہوں
زخمِ جاں پر دماغ جیسا ہوں



سینے میں سانس سانس پریشاں ہے دیکھنا
جب سے زمینِ دل مِری ویراں ہے دیکھنا

آئی نہیں سمجھ کبھی انساں کو اِس قدر
دو چار پل کا دہر میں مہماں ہے دیکھنا

ہر سمت اُٹھ رہا ہے دھواں رنج و درد کا
لاچار کس قدر ہوا انساں ہے دیکھنا

محرومِ رنگ و بُو ہُوا پھر پھُول سا بدن
یہ گُلستاں بھی کوئی گلستاں ہے دیکھنا

شیؔدا یہ کم نہیں کوئی محرومیء حیات
میرے ہی ہاتھ میرا گریباں ہے دیکھنا



سرتک جو آ گیا تھا وہ پانی اُتر گیا
تیرے بنا عذاب کا دن بھی گزر گیا

رکھا تھا ایک خواب جو آنکھوں کے درمیاں
اشکوں کے ساتھ خاک پہ وہ بھی بکھر گیا

اب دل کی دھڑکنوں پہ بھروسہ نہیں رہا
تم بھی یہ دیکھ لینا کہ اس بار سر گیا

چھایا ہوا تھا خوف دَر و بام پر عجب
برسوں کے بعد لوٹ کے جب اپنے گھر گیا

شیداؔ میں کیا بتاؤں کہ اُس بزمِ ناز سے
آیا تھا مُسکراتا ہُوا ، چشمِ تر گیا



اب کس لیے جہان یہ زیرِ عتاب ہے
کیوں اِس کی زندگانی مسلسل عذاب ہے

اُلجھے ہوئے سوال کی صورت ہے وہ حسیں
اور دیکھنے میں وہ تو کھُلی سی کتاب ہے

آئی ہے گُلستاں میں عجب رُت بہار کی
جوبن کسی کلی پہ نہ گل پر شباب ہے

اِس زندگی نے درد میں رکھا سدا مُجھے
سانسوں کا جو یقین ہے اب وہ بھی خواب ہے

اِس درد نے بگاڑ دیے میرے خد و خال
شیداؔ مِرا شباب وبالِ شباب ہے



جو بات دل میں ہے وہ بتا دینا چاہیے
سینے سے اب یہ بوجھ ہٹا دینا چاہیے

اک زخم بن گئی ہے ترے غم میں زندگی
اب یہ فصیلِ جسم گرا دینا چاہیے

انجام جو بھی ہو مری جاں اس سے بے نیاز
خُود کو تری طلب میں گنوا دینا چاہیے

ممکن ہے لوٹ آئے وہ بچھڑی ہوئی سحر
اپنے لہو سے دیپ جلا دینا چاہیے

شیدؔا علاجِ دردِ تمنا یہی تو ہے
سانسوں کا اضطراب بڑھا دینا چاہیے



یہ کیسا دورِ ستم گار آ گیا اب کے
فضا پہ خوفِ اجل کیسا چھا گیا اب کے

کرن کرن یہاں زخمی ہے روشنی کا بدن
یہ کون تیشۂ شب آزما گیا اب کے

ہمیشہ جس نے بُجھائے تھے میرے گھر کے چراغ
مِرے نصیب کا سُورج بُجھا گیا اب کے

میں اپنے دُشمنِ ایمان سے نپٹ لُوں گا
کبھی جو سامنے میرے وہ آ گیا اب کے

میں آرزُو کے کھنڈر میں سُلگ رہا ہوں دوست
وہ کیسی آگ سی دل میں لگا گیا اب کے



میں جو برباد ہُوا درد کی طُغیانی سے
جسم برباد ہُوا اپنی ہی نادانی سے

دل کی دھڑکن بھی ترے درد میں کھو دی میں نے
کٹ گئی زیست بھی سانسوں کی فراوانی سے

ہر نفَس شور سا اک ایسا بپا رہتا ہے
کانپ اُٹھتا ہوں میں اب اپنی ہی حیرانی سے

اِس لیے گھر کے یہ دروازے کھُلے رکھے ہیں
وہ کہ آنگن میں گزر آئے گا آسانی سے

ہر گھڑی وجد میں رہتا ہوں میں شیداؔ اب کے
ہر گھڑی میری معطر ہے ثنا خوانی سے



جب بھی نئے بنائے زمانے چراغ سے
لینا پڑا ہے کام پُرانے چراغ سے

روشن ہوئے ہیں آج حقیقت کے رُوپ میں
میں نے لکھے تھے جتنے فسانے چراغ سے

سُورج کی روشنی کی چمک ہے وہی، جو تھی
دُنیا تراشتی ہے فسانے چراغ سے

اک لمحہ بھی سکون سے جینے نہ دے کبھی
باندھا ہے کیسا عہد ہوا نے چراغ سے

پھر سے دلِ مگس کی ہیں شیرازہ بندیاں
بن بن کے گر رہے ہیں جو دانے چراغ سے



میرے چہرے پہ اگر اُس کو بھروسہ ہوگا
آئنہ پھر نہ کبھی ٹوٹ کے رُسوا ہوگا

لوٹ کر آئے گا جب موسمِ ظلمات کبھی
اک دیا آنکھ کی دہلیز پہ رکھا ہوگا

ہم کچھ اس طرح سنواریں گے محبت کا شجر
زیست کے صحن میں ہر سانس پہ سایہ ہوگا

کام آئے گی اندھیروں میں مِرے دل کی جلن
میرا ہر اشک شبِ غم میں ستارا ہوگا

جگمگائے گا تمناؤں کا سُورج ایسے
ہم جہاں جائیں گے ہر سمت اُجالا ہوگا

آسماں پاؤں میں پھیلے گا زمیں بن کے کبھی
میرے اس عہد کا انسان یوں اُونچا ہوگا ۔



اُس چشمِ التفات نے یہ معجزہ کیا
مُجھ کو دیے کی لو سے ستارا نما کیا

مجھ پر کھُلی ہے راہِ حقیقت مجاز میں
تیری طلب نے مجھ کو خدا آشنا کیا

جب دشتِ آرزو کی طرف چل پڑا تھا میں
کس نے مرے وجود سے سایہ جدا کیا

خُلاقِ کائنات کی تقسیم کیا کہوں
تجھ کو شجر کیا، مجھے برگِ نوا کیا

تم نے بچا بچا کے رکھی اپنی روشنی
ہم نے دیا جلایا تو نذرِ فضا کیا

اپنے بدن کی قید میں پتھر نما تھا میں
اُس نے مجھے تراش کے اک آئنہ کیا

شیداؔ جہاں زمانہ بھی تھک ہار کر گرا
میں نے وہیں سے اپنا سفر ابتدا کیا



میرے وطن کے جوہرِ نایاب لے گیا
سیلِ ستم تو جینے کے اسباب لے گیا

مضبوطی کے لیے تھا کیا لیپ پر جو لیپ
وہ سوکھنے نہ پایا تھا سیلاب لے گیا

جو اشک تھے سنبھالے درِ یار کے لیے
آنکھوں میں جتنا آب تھا، یہ آب لے گیا

بوڑھا مرا کہ مہنگی دوا بھی نہ مل سکی
بیٹے کا آسرا تھا کہ سیلاب لے گیا

امداد آ رہی ہے سُنا ہم نے رات بھر
آئی خبر یہ صُبح کہ سیراب لے گیا

کر کے تمام بستیاں غرقاب لے گیا
"مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا"

شیداؔ وہ ایک موجۂ بے نور دیکھنا
چَھٹنے کو تھا اندھیرا کہ سب خواب لے گیا



وہ کبھی لوٹ کے جو گھر آئے
دل کا آنگن خوشی سے بھر جائے

ساری دنیا سیاہ ہوتی ہے
چاند جب آرزو کا گہنائے

دل کے ہمراہ ایک سایہ بھی
میرے سینے میں رقص فرمائے

جب بھی روشن ہوئی ہے دل کی طلب
گھیر لیتے ہیں رات کے سائے

کہہ دو اس آرزو سے اے شیداؔ
اِس قدر بھی نہ پاؤں پھیلائے



شبِ تاریک میں روشن کہاں ہُوں!؟
میں اپنی آرزوؤں کا دھواں ہوں

فقط اُس شخص سے نالاں نہیں میں
میں اپنے آپ سے بھی بدگماں ہوں

مرا دامن بھرا ہے روشنی سے
میں اپنی ذات میں اِک کہکشاں ہوں

مُجھے وہ اس طرح بھُولا ہُوا ہے
میں جیسے کوئی حرفِ رائیگاں ہوں

مرا ہونا ہے رنگینی جہاں کی
میں ہر موسم کا حُسنِ جاوداں ہوں



لاکھ چاہا یقیں نہیں ہوتا
دل کا موسم حسیں نہیں ہوتا

خواہشِ دل کو کون سمجھائے
آسماں تو زمیں نہیں ہوتا

خوف آتا ہے بزمِ دُنیا سے
جب وہ میرے قریں نہیں ہوتا

لاکھ ذرّے کو تم اُچھالا دو
کبھی عرشِ بریں نہیں ہوتا

کتنا بے ذوق ہے یہ شیداؔ بھی
دل کے گھر میں مکیں نہیں ہوتا



ایسے ہر پل گزارتا رہا میں
موت کی قسط اتارتا رہا میں

زندگی تھی کہ بس بکھرتی رہی
اس کے سب بل سنوارتا رہا میں

غم کے بادل کہ گھیر لیتے تھے
روشنی کو پکارتا رہا میں

کیسے فریاد آسماں ہوتی
ہاتھ اپنے پسارتا رہا میں

صورتِ آسماں اَنا شیدؔا
اُس کو نیچے اُتارتا رہا میں



کیا کیا نہ زمانے میں ہوا، کیا نہیں ہوتا
جیسا مجھے مطلوب ہے، ویسا نہیں ہوتا

کر بیٹھے دل و جان فدا اُس پہ و لیکن
وہ شوخ کسی طور ہمارا نہیں ہوتا

مانا کہ ترے قرب میں بھی جاں کا زیاں ہے
پر اس کے بنا بھی تو گزارہ نہیں ہوتا

ہُوں گوش برآواز مگر خانہء دل میں
ہوتا ہے مگر کوئی تماشا نہیں ہوتا

ہوتی ہے ضرور اُس میں کوئی بات وگرنہ
بے وجہ کسی کا کوئی شیدا نہیں ہوتا



شبِ فرقت میں مسکرائے بھی
ہم نے چاہت کے گیت گائے بھی

حبس ہے دوپہر کا ہر جانب
جل بجھے ہیں بدن کے سائے بھی

راس آیا نہیں جہاں پھر بھی
پاؤں چادر سے ہیں گھٹائے بھی

بُجھ نہ جائے یہ انتظار کی لَو
جس کو آنا ہے لوٹ آئے بھی

شیداؔ اپنے بھی ہیں خفا مجھ سے
اور ہیں بدگماں پرائے بھی



کیا کہوں جھومتی بہاروں میں
کس نے رکھا مجھے شراروں میں

جل بُجھے سارے سایہ دار شجر
دھوپ پھیلی ہے رہ گزاروں میں

آسمانِ طلب کو کیا معلوم
کون جلتا رہا ستاروں میں

ماتمی پیرہن فضاؤں کا
موت رقصاں ہوئی نظاروں میں

موجِ دریا سے بچ کے اے شیدؔا
کشتیاں کھو گئیں کناروں میں



ڈھلتے ڈھلتے ڈھل جاتے ہیں
سائے راہ بدل جاتے ہیں

جب بھی دو دل ملتے دیکھیں
دُنیا والے جل جاتے ہیں

جِن کا کوئی نہیں ہوتا ہے
وہ بچے بھی پل جاتے ہیں

قسمت اچھی ہو تو صاحب!
سَیلِ بلا بھی ٹل جاتے ہیں

شیدؔا کون ہے جس کی جانب
لوگ سروں کے بل جاتے ہیں



ڈھواں تصویر کرنا
شرر تحریر کرنا

سحر کی جستجو میں
دیے زنجیر کرنا

وفا کے گیت گانا
یہی تقصیر کرنا

کماں آنکھیں بنا کر
نظر کو تیر کرنا

نہیں آیا ، یہ مٹی
ہمیں اکسیر کرنا

کبھی جاوید شیدآ
لہو تنویر کرنا



یہ مری کائنات جب سے ہے
زندگی موت کے سبب سے ہے

دوست احباب ہوں کہ دشمن ہوں
مِلنا جُلنا مرا تو سب سے ہے

میں جو جیتا ہوں معتبر ہو کر
یہ ہُنر پیار کے سبب سے ہے

کیا تجھے کچھ پتا بھی ہے کہ یہ دل
صورت انتظار کب سے ہے

قید رہتا ہوں اُس کی خواہش میں
ماورا جو مری طلب سے ہے

شعر کہتا ہوں اس لیے شیدآ
میرا ہونا فقط ادب سے ہے



خواہشِ دل بکھر نہ جائے کہیں
دِید کا پل گزر نہ جائے کہیں

اِک تری راہ کے علاوہ دوست
اور میری نظر نہ جائے کہیں

یہ جہاں چھین لے نہ مجھ سے تجھے
لاکھ چاہوں، یہ ڈر نہ جائے کہیں

اس قدر مجھ پہ مہربان نہ ہو
دامنِ شوق بھر نہ جائے کہیں

تجھ سے شیدؔا کا یہ تقاضا ہے
تُو کبھی عمر بھر نہ جائے کہیں



میں میں رہا ہمیشہ، کبھی میں نہ تُو ہُوا
اپنا رہا نہ پیار میں ، اپنا عدو ہُوا

یہ زندگی ہے ہستی و پستی کے درمیاں
دریا ہی بن سکا ہوں نہ میں آبِ جُو ہُوا

میرے لبِ دُعا پہ طلب آ کے رُک گئی
میں تیری جستجُو میں سدا کُو بہ کُو ہُوا

تُجھ کو چھپا چھپا کے رکھا پھر بھی میرے دوست
رُسوائیوں کا چرچا مرے چارسُو ہُوا

شیدؔا کبھی تو چاک گریباں ہُوا میرا
اور پیار میں کبھی مرا دامن لہُو ہُوا



یوں ہے ملنا جناب کا ملنا
جیسے تعبیرِ خواب کا ملنا

ان سے کوئی سوال کر دیکھیں
گو ہے مشکل جواب کا ملنا

میرے عصیاں پہ ضرب کاری ہے
رحمتِ بے حساب کا ملنا

لکھنے والا بھی مل ہی جائے گا
اب ہے کافی کتاب کا ملنا

تا قیامت نگاہ جو بخشیں
وہی جانیں ثواب کا ملنا

ہے کسی کی دعا کا یہ تو ثمر
مجھ کو اُن سے خطاب کا ملنا

تجھ کو جوہر بنا گیا شیدآ
اک گھڑی اک جناب کا ملنا



جب دیا پیار کا جلایا ہے
آندھیوں کو قریب پایا ہے

ایک پل بھی تری جُدائی میں
کون کافر جو مُسکرایا ہے

جب سے اُتری ہے دھوپ فُرقت کی
مجھ سے بے زار میرا سایا ہے

زندگی بھر کی اِس کمائی میں
اک ترا درد ہاتھ آیا ہے

سوچتا ہوں ترے لیے سب کچھ
میں نے کیا سوچ کے گنوایا ہے

وہ جو دُشمن ہے دل کا اے شیدؔا
دھڑکنوں میں وہی سمایا ہے



تُجھ کو جب بھی بھُلانے لگتے ہیں
اشک آنکھوں میں آنے لگتے ہیں

زخمِ دل جب اُنھیں دکھاتا ہوں
وہ بہت مُسکُرانے لگتے ہیں

عشق کا راستہ بدلنے پر
میرے ہم دم زمانے لگتے ہیں

جب بھی آنے لگے قرار ذرا
وہ مرا دل دُکھانے لگتے ہیں

کانچ کی طرح اُن کی فُرقت میں
ہم سدا ٹُوٹ جانے لگتے ہیں

جب بھی مِلنا ہوا اُن سے اے شیداؔ
وہ بہانے بنانے لگتے ہیں



جو بھی تھا عشق میں لُٹا بیٹھے
اپنا سارا بھرم گنوا بیٹھے

چل دیے چھوڑ کر جو رستے میں
دے رہے ہیں اُنہیں دُعا بیٹھے

اب سحر ہو نہ ہو ہمیں کیا ہے
زندگی کا دیا بجھا بیٹھے

میرے دامن میں ڈال کر کانٹے
وہ چمن زیست کا سجا بیٹھے

ختم ہوتی نہیں سزا اپنی
جانے کیا ایسی کر خطا بیٹھے

یاد پھر اُن کی آ گئی شیداؔ
ہم اُنھیں کیا ذرا بھلا بیٹھے



جب سے وہ میرے پیار سے ہم دم مُکر گئے
جتنے تھے پھول دل میں وفا کے بکھر گئے

موسم ہی وہ تو حشر ادا تھا وگرنہ دوست
اتنا پتا تو چلتا کہ ہم بھی کدھر گئے

وابستگیِ شوق جو ٹُوٹی تو سوچا ہے
دل سے جو ایک جان تھے کیسے اُتر گئے

کہلائے ایک دُوسرے کے ہم ہمیشہ ہی
اِک دوسرے کو کھو کے جہاں میں جدھر گئے

شیداؔ ہمیشہ تم تو ادھر کے ادھر رہے
وہ لوگ تو کنارے پہ کب کے اُتر گئے



اشک یوں چشمِ تر سے گرتے ہیں
جیسے پتّے شجر سے گرتے ہیں

وہ کبھی معتبر نہیں ہوتے
جو کسی کی نظر سے گرتے ہیں

تُو مجھے جس گھڑی دکھائی نہ دے
دل پہ جیسے شرر سے گرتے ہیں

تیری فرقت میں دل کے آنگن میں
خوف دیوار و در سے گرتے ہیں

آنکھ کے ساتھ ساتھ اب شیؔدا
خُوں کے آنسو جگر سے گرتے ہیں



بیعت ہوئی ہے عشق کے جس دن امام کی
تسبیح کر رہا ہوں فقط تیرے نام کی

یہ بھی نہ ہو سکا کہ اُسے چھو کے دیکھ لوں
اک عمر جس کے پیار میں، میں نے تمام کی

جو ساعتوں میں سب سے سہانی تھی وہ گھڑی
جو تُو نہیں ،تو مجھ کو ڈراتی ہے شام کی

اک وہ کہ اُس کو بات مری زہر سی لگے
دُنیا ہے معترف مرے حُسنِ کلام کی

کارِ جہاں میں اُلجھے ہوئے ہیں کچھ اس طرح
فُرصت ذرا نہیں ہے سجود و قیام کی

رشتوں کا لے کے جاؤں تقدُّس بھلا کہاں
عادت نہیں کسی کو یہاں احترام کی

شیؔدا میں روشنی کے تعاقُب میں چل پڑا
ہاتھوں میں لے کے شمع محبت کے نام کی



دُنیا یہ کہہ رہی ہے کہ کیا کر رہا ہوں میں
ملنے کی تجھ سے پھر سے دُعا کر رہا ہوں میں

برسوں سے ایک حسرتِ ناکام کے لیے
اِس زندگی سے کتنا بُرا کر رہا ہوں میں

جذبوں کو آنچ دے کے تمھارے خیال کی
محشر سا اپنے دل میں بپا کر رہا ہوں میں

وہ اشکِ درد آ کے جو پلکوں پہ جم گیا
خود کو جلا کے اُس کو گھٹا کر رہا ہوں میں

تُو نے کیے ہیں لاکھ ستم میری جان پر
پھر بھی خلوصِ دل سے وفا کر رہا ہوں میں

شیؔدا ہے دُھوپ تحفہ ندیمِ بہار کا
اپنے بدن سے سایہ جُدا کر رہا ہوں میں

''شیدآ ہے کون''

اس بھری دُنیا میں رہتے ہُوئے دُنیا سے بے نیاز، بے خبری میں بھی باخبر، ہمہ جہت شخصیت جاوید شیدآ کی شاعری کئی سمتوں کو جاتے ہوئے راستوں کی طرح ہے، وہ ہر راستے پر نظر آتا ہے، وہ منزلوں کو نگاہ میں رکھتا ہے اور وہ کہیں اور کہاں کے درمیان اپنا پڑاوٗ کرتا ہے۔ نارسائی تک رسائی پانے کی اِس کی خواہش ابھی بھی زندہ ہے باوجود اس کے کہ

؎ منزل کے ہر نشان سے ہم باخبر ہُوئے
جِس دِن سے وقفِ سوزشِ خاکِ سفر ہُوئے

؎ گمانِ یقیں سے یقینِ گماں تک
رسائی ہے میری کہاں سے کہاں تک

؎ اندھیری رات میں تارا دکھائی دیتا ہے
نزولِ حق کا اشارہ دکھائی دیتا ہے

؎ یہی تو اصل منافع ہے میری جان مرا
جو دیکھنے میں خسارہ دکھائی دیتا ہے

جاوید شیدآ تنہائی پسند ہے مگر پھر بھی ہر وقت اپنے اردگرد مدّاحوں کے میلے سے اُکتاتا نہیں ہے یا یُوں کہیۓ کہ اس کی ہُنر مندی نے اکلاپے سے اِس قدر آشنا کر دیا ہے کہ اکلاپے کی اہمیّت و کیفیت سے خوب واقِف ہو گیا ہے۔ بقول منیر نیازیؔ

''شیداؔ کولفظوں کا گہرا شعور حاصل ہے ان کے لئے لفظ کی اہمیت سے واقف ہونا کیفیت کی ترجمانی کا باعث ہے اور ان کے اندر شاعری خصوصاً ''کافی'' کے سوتے کہیں اور سے پھوٹتے ہیں، کوئی ہے جو راہ عدم پر چلے جانے کے باوجود لمحہ بہ لمحہ اِن کے ساتھ ساتھ ہے اور مشکل سے مشکل ترین منزلیں سر کروا رہا ہے۔''

''دشتِ شب'' کی مسافت ہر کسی کے بس کی بات نہیں مگر واقعی کوئی ہے جس نے شیداؔ کو ایک ہی جست میں پار لگا دیا ہے۔ شیداؔ گزشتہ سے پیوستہ رہنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہے وہ جدّت کی سیج پر بیٹھ کر روائیت بیان کرتا ہے۔ میری شیداؔ سے گہری قُربت ہے مگر پھر بھی میرے اندر شیداؔ کو مزید جاننے کی طلب باقی ہے۔

شیداؔ کی تمام ادبی خدمات کے عوض اب تک حکومتی ایوارڈز سے نوازا جانا چاہیے تھا، جس کے لیے میں دُعا گو ہوں۔

ڈاکٹر اجمل نیازی

رنگ اور خوشبو کا شاعر

غزل کو اگر شعور کی معراج کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے یہ وہ گلستان ہے جس میں ہر رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور ہر طرح کی خوشبو آتی ہے، اس میدان میں نکلنے والوں کی تعداد یوں تو لاکھوں میں ہے مگر منزلِ مقصود پر پہنچنے والے خوش نصیبوں میں سب شمار نہیں ہوتے جاوید شیدآ کی غزل کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں کیفیات کی کارفرمائی پوری آب و تاب سے نہ صرف موجود ہے۔ بلکہ ہر حرف شہنائی کی طرح کانوں میں رس گھولتا ہے۔ اُنہوں نے جس شانِ بے نیازی سے غزل کی مانگ میں تصوف کا رنگ بھرا ہے وہ اُن کی طبع حلیم اور جذبہ ایثار کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ شعر کی روانی اور آسان زبان محبت اور عظمت کی پہچان کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ''دشتِ شب'' کے شاعر ہر ذی شعور کی جانب سے مبارک باد کے قابل ہیں۔ اچھوتے مضامین مناسب پیرائے میں رونق افروز ہیں اور یہی خوبی شاعر اور شاعری کی جان قرار پاتی ہے۔ مشکل زمینوں میں آسان شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جدت اور روایت کی سرحد پر کھڑے ہوئے شاعر جاوید شیدآ آنے والی نسلوں کے لیے ادبی حوالے سے مشعل راہ ہیں۔ میں ان کی مزید کامیابی کے لیے دُعا گو ہوں۔

اقبال راہیؔ

''دشتِ شب''

مُستنصر حسین تارڑ کا صحرا نوَرد دیکھا نہیں پڑھا تھا، مگر ''دشتِ شب'' کا دشت نوَرد پہلے دیکھا اور پھر پڑھا ہے۔ دیکھا یُوں کہ مدھم چال، دھیما لہجہ، شائستہ اطوار کے ساتھ خلاؤں میں گھوُرتا حیران سا، سادہ مگر پُروقار ایک شخص جِسے دیکھ کر ہی احساس ہوتا تھا کہ اِنسانی جبلی تقاضوں سے جُڑا کائنات کے اِسرار پانے اور روشنی کی طرف لپکنے کی جُستجوُ میں بے چین کچھ عیاں، کچھ پنہاں وجود ہے جو روشنیاں بانٹنے کے لئے جگنو ہاتھ میں لئے پھرتا ہے۔ اپنے مرتبے اور رُتبے کو اِنکساری سے قائم رکھنے کا مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی رُوپ ہے۔

اِتنا گداز دِل کہ ایک دفعہ الحمراء کی سیڑھیوں سے پاؤں پھسلا اور گِر گئی، اُس وقت بھی شب کا سیاہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک مُشفق ہاتھ روشنی کے ہالے کی طرح آگے بڑھا اور گرسی دیتے ہوئے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اندھیرے میں فرشتوں جیسے تقدس کی ضیاء نے لمحہ بھر کو تکلیف بُھلا کر اخلاق کی اِس اعلیٰ ظرفی پر غور کرنے پر مجبور کر دیا۔

جاوید شیدآ کے لئے شائد وہ بہت ہی معمولی سا سانحہ تھا اور شائد اُنہیں یاد بھی نہ رہا ہو، مگر اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہمدردی اور خلوص کا وہ لمحہ میرے احساس پر نقش ہے۔ بعض اوقات ایک چھوٹا نقطہ ہی دائرہ بن جاتا ہے اور کوئی چھوٹا سا واقعہ ہی کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مشاعروں میں کئی بار ان کو سُنا۔ اُردو غزلوں کے ساتھ پنجابی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ اشعار کو بار بار فرمائش کے ساتھ سُنا۔

؎ جیون دا نئیں کُجھ بھرواسہ
جیون پانی وِچ پتاسہ
؎ رُڑھدا جاوے، کھُردا جاوے
بھورا بھورا، ماسہ ماسہ

میرا خیال ہے زندگی کی بے ثباتی کی حقیقت کو اِس سے بہتر انداز میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اچھا تاثر تھا جو عام طور پر ہر اچھے شاعر کے لئے ہوتا ہے مگر "دشتِ شب" پڑھ کر یہ تاثر حیرت میں بدل گیا۔ میرا اندازہ غلط نہ تھا کہ اندھیری رات میں دشت کے سناٹے میں سفر کرنے والا ایک معصوم مسافر ایسے سورج کو ہتھیلی پہ اُتارنا چاہتا ہے جس کی روشنی دُور دُور تک پھیلا سکے۔ اُس کی آنکھ ایسے صُوفی کی آنکھ لگتی ہے جو روشنی بن کر دشت میں بہت کچھ تلاش کر لیتی ہے کیونکہ اُس کے دل کی سرزمین دشت نہیں، زندہ سانس لیتی تمنائیں ہیں جو صحرا سے گلستانوں میں جانا چاہتی ہیں، اندر کوئی دھوپ نہیں، سایہ ہی سایہ ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ "میں سراپا چراغ جیسا ہوں" اور کہتے ہیں کہ "میں دھوپ میں سایہ بن جاتا ہوں" کیونکہ "میری فطرت پیڑوں جیسی ہے"۔

اُن کے خوبصورت اشعار:

؎ دھوپ جو اُتری ہوئی تھی زندگی کے دشت میں
میری ہمّت نے اُسے بھی سائبانِ کر دیا

اور

؎ اک عمر مجھ میں دھوپ کا صحرا اُتار کر
اِن موسموں نے شاخِ بدن کو شجر کیا

بُلھے شاہ نے فرمایا......

الف اللہ دِل رتہ میرا
مینوں ب دی خبر نہ کائی
ب پڑھیاں کُجھ سمجھ نہ آوے
الف دی لذّت آئی

لگتا ہے جاوید شیدا نے ''د'' میں اِسی طرح کی لذت پائی ہے۔ دشت، درد، دُھوپ، دوپہر، دِل، دُوری، دَرؔ اور خصوصاً دھوپ کو مجید امجد کی طرح استعارہ بنا کر ہزاروں خوشگوار اور سوگوار معنوں میں بانٹ دیا ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں بھی دھوپ، درخت اور سائے کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ جیسے شیتل شیتل دھوپ۔ بھیگی بھیگی نتھری نتھری۔ جلتی جلتی۔ سہمی سہمی۔ تپتی ہوئی دھوپ وغیرہ۔ جیسے

؎ اِس جلتی دھوپ میں گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دُوں جو بن پڑے

مگر جاوید شیدا کی شاعری میں اس کے برعکس سایہ، روشنی، چراغ اور اُجالا کے حوصلہ افزا استعارے بھی جا بجا اِن کی بینائی بھری آنکھ اور اِدراک کے غماز ہیں۔

لگتا ہے شاعری اِن کا جنون ہے اور اس جنون کے ساتھ ادب کے سمندر میں پتواروں کے بغیر ہوا کے رُخ پر سفر کر رہے ہیں۔ روائتی شاعری سے منسلک بھی ہیں لیکن اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر بے جھجک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شاعری میں خوامخواہ کی گھن گرج اور غیر ضروری فلاسفی کم ہے۔ ہاں ایک فلسفہ (بقول ان کے)

کہ جب میری غزلیں لوگوں کو ازبر ہو جائیں گی تو ''دشتِ شب'' منظرِ عام پر آئے گی اور ایسا ہی اُنہوں نے کیا! گویا کسی فلم کی ریلیز سے پہلے اُس کے گانوں کا لوگوں میں مقبول ہونا اُس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ مگر ''دشتِ شب'' کی کامیابی کی کسی فلم سے کوئی مماثلت نہیں اس لئے کہ یہ کرداروں سے جوڑی ہوئی کوئی کہانی نہیں بلکہ جاوید شیدآ خود اپنے مزاج کی نرمی، حلاوت اور اپنی شخصیت کے ہر پہلو کے ساتھ ''دشتِ شب'' میں موجود ہے۔ وہ گُھنّے، گُھنّے اور مِیسنے شاعر نہیں کہ جن کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا اپنی طرز کا مطلب نکالتا ہے۔ جاوید شیدآ بے ضرر انسان ہیں اور ان کی شاعری بھی اِن کی بے ضرر سوچ کی غماز ہے اور ان کی سوچ کو سمجھنے کے لئے بھی بے ضرر سوچ چاہئے۔

کہتے ہیں ہر انسان کے اندر ایک اور انسان رہتا ہے۔ جیسے وہ خود بھی نہیں جانتا اور اُسے جاننے کی طلب اور جستجو اُسے اُس مقام پر لے جاتی ہے جہاں جاوید شیدآ پکار اُٹھتا ہے۔

ے اُسے ڈھونڈتے جب نظر تھک چکی تو
یہ دِل بول اُٹھا یہاں ہے یہاں ہے

عذرا مرزا

محبت کا مسافر

جاوید شیداؔ محبت کا مسافر ہے، محبت اس کا طرزِ زندگی ہے۔ محبت بوتا ہے اور محبت کاٹتا ہے۔ جو بھی اس کے دائرۂ محبت میں آ جائے وہ بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا رہتا ہے مگر جا نہیں سکتا۔ وہ جس سے بھی محبت کر لے، اُس کی خیر نہیں۔ خیر تو شیداؔ کی اپنی بھی نہیں رہتی کیونکہ محبت کا نبھانا آسان کام نہیں۔ اسی لئے شیداؔ کو کہنا پڑا۔

ؔ اِسی محبت نے کتنے سالوں سے
اک اذیّت میں ڈال رکھا ہے

ؔ میں نے تعلقات نبھائے تمام عمر
لیکن مرے وہ کام نہ آئے تمام عمر

شیداؔ کی شخصیت میں کئی رنگ برنگے پہلو ہیں۔ وہ شاعر ہے، کالم نگار ہے، ناول نگار ہے، افسانہ نگار ہے، ڈرامہ نویس ہے، ادبی پروگراموں کا میزبان ہے، جمال پرست ہے اور ہر محفل میں جانِ محفل بن جاتا ہے۔ چاہے فنونِ لطیفہ کی محفل ہو، چاہے روحانی محفل ہو، وہ طوطیٔ ہزار داستان ہے۔ وہ ہر محفل میں چھا جانے پر قادر ہے۔ اب ایسے شخص سے کوئی بچے تو، کس طرح بچے؟ جو شخص یہ کہتا ہو۔

دھوپ میں سایہ بن جاتا ہوں
میری فطرت پیڑوں جیسی

اَب ہستی کی کڑی دھوپ میں ایک شجرِ سایہ دار سے گریز، کس طرح ممکن ہے۔ شیداؔ محبت کی حقیقت سے آشنا ہے اور کہتا ہے۔

ؔ لفظ جب سے لکھا محبت کا
راز مجھ پہ کُھلا حقیقت کا

حضرت واصف علی واصف ؒ نے فرمایا ہے کہ وفا تو ہوتی ہی بے وفا کے ساتھ ہے۔ گویا جس سے بھی محبت کر بیٹھیں اُس سے تو نبھانی پڑتی ہے۔ اگر محبت کا جواب محبت سے ملے تو محبت نبھانا کمال نہ ہوا۔ مزا تو جب ہے کہ بے وفا سے وفا کی جائے۔ شیدآ کا کہنا ہے۔

ؔ اب دھیرے دھیرے پاگل ہونے والے کو
دانش مند بنانے میں تو وقت لگے گا

شیدآ رُوٹھوں کو منانے کے سلیقے سے بہرہ وَر ہے۔ وہ محبت کے معاملے میں انا کا اسیر نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی بات طبعِ محبوب پر گراں گزرے تو وہ کہہ دیتا ہے۔

ؔ مری بات کا تم بُرا مت منانا
مجھے بولنے کا سلیقہ کہاں ہے

یُوں سرِ تسلیم خم کر دینے والے سے کوئی ناراض تو رہ کر دکھائے!

شیدآ ازل سے جمال پرست ہے۔ حُسن کا مظہر کچھ بھی ہو، شیدآ ہر حال میں اُس کا شیدا ہے۔ جہاں کوئی رنگ و نور کا مرقع ہو، کوئی چاند چہرہ ہو، کوئی آبروئے گلشن ہو، کوئی وادیٔ جاں فزا ہو، کوئی کنارِ آبجو ہو، کوئی دشتِ شب ہو، شیدآ وہیں ٹھٹک جاتا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے۔

ؔ ہر شخص کو ملتی نہیں بینائی بھری آنکھ
ہر شخص کو ہوتا ہے کہاں حُسن کا اِدراک

شیدآ بہت خوش نصیب ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے ایک مشہور بزرگ قطب الاقطاب حضرت سید محمد وجیہہ السیماءِ عرفانی ؒ سے وابستہ ہوا۔ شیدآ کو زندگی کے

ہر شعبے میں جو شہرت اور کامیابی نصیب ہوئی لامحالہ یہ اس کے مُرشد کا فیضِ نظر ہے۔ شیداؔ کے کلام میں جو رُوحانیت کی جھلک ہے وہ اُسی رُوحانی تعلق کی عکاسی ہے۔

شیداؔ کی محبت کے کچھ اسیر آج اس محفل میں موجود ہیں، جو زندگی کی مصروفیات کو نظر انداز کر کے آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ محبت کا جواب محبت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ شیداؔ ہر حال میں جن کا شیدا ہے وہ بھی ہر حال میں شیداؔ کے شیدا ہیں۔

ہستی کی کشاکش میں بھی بھولے نہیں اس کو
شیداؔ کے جو شیدائی ہیں سودائی بہت ہیں

طارق واصفیؔ

''دشتِ شب'' میں جگنو کی تلاش

جاوید شیدآ کی شاعری کی کتاب کھولی تو سب سے پہلے جو صفحہ میرے سامنے آیا۔ وہ ''ماں'' کے عنوان سے مزیّن تھا۔ مگر مجھ میں اور جاوید شیدآ میں ایک فرق ہے کہ میری ماں کو مجھ سے بچھڑے ہوئے ایک یگ بیت گیا اور جاوید پر ان کی ماں کا سایا قائم ودائم ہے اور خدا سے دعا ہے کہ یہ سایہ جاوید پر بنائے رکھے۔ آمین۔

کوئی ثانی نہیں جہاں میں تیرا
تیری ہستی عظیم ہستی ہے

کتنا اونچا ہے مرتبہ تیرا
اوجِ افلاک تیری پستی ہے

ماں کی عظمت کا کیا کہوں شیدا
اس میں پنہاں خدا کی ہستی ہے

مین نہیں جانتی کہ ماں کیسی ہوتی ہے مگر شیدآ کے اشعار نے بتایا کہ ماں ایسی ہوتی ہے۔ خیر چھوڑ یئے یہ تو ایک جذباتی سا حوالہ تھا۔ آیئے ان کی شاعری کے مجموعہ ''دشتِ شب'' کے اگلے صفحے کو الٹتے ہیں اگلے ہی صفحے پر جو غزل ہے اس کا مطلع ہے۔

کوئی چراغ جلاؤ کہ شب نہیں کٹتی
غزل کا ساز اٹھاؤ کہ شب نہیں کٹتی

ہمارے دل کو ضرورت ہے روشنی کی بہت
اُس آفتاب کو لاؤ کہ شب نہیں کٹتی

میرے خیال میں یہ ایک شب یا ایک فرد کی بات نہیں ہے بلکہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی پوری پاکستانی قوم نوحہ کناں ہے کہ اس تاریکی سے، ان مسائل سے ہمیں نجات دلائی جائے اور قوم پر تو تمام دن بھی شب جیسے ہیں اور ان حالات کو بدلنے والے رہنما کی خواہش پائی جاتی ہے اور جس چراغ کی بات شیدآ صاحب کر رہے ہیں وہ رہنما ہیں جو ہمیں تاریکی سے روشنی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

جاوید شیدآ کی شاعری ایک حساس اور باخبر انسان کی شاعری ہے جو اپنے عوام کے اور ملکی حالات دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے کیونکہ ایک تنہا شخص کچھ نہیں کر سکتا اور یہی فرد کا دکھ ان کی شاعری میں ہمیں نظر آ رہا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چل کے خود دار و رسن کی سمت اُس منصور نے
موت کے مفہوم کو بھی زندگانی کر دیا

یا

کیا کیا نہ زمانے میں ہوا کیا نہیں ہوتا
جیسا مجھے مطلوب ہے ویسا نہیں ہوتا

ہونٹ کُھلتے نہیں دعا کیلئے
ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

یہ جو شاعر چاہتا ہے جو اس کی خواہش ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے، جس کے لئے دعا مانگنا چاہتا ہے اور جب وہ خواہش، تمنا اور دُعا پوری نہیں ہوتی تو شاعر "دشتِ شب" میں آنسوؤں کے ہار پروتا ہے۔ کیونکہ

دی نہ مہلت اِس قدر بھی اِس زمانے نے ہمیں
پیار کے نغمات ہم بھی گنگنا کر دیکھتے

جاوید شیداؔ کی شاعری ایک باشعور انسان کی شاعری ہے اور پھر ایک ایسا انسان جو ہرفن مولا ہو۔ اس کی شاعری میں سارے فنون کا عکس ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ؔ ہم ایسا بے سر و ساماں بھی کوئی کیا ہو گا
کہ سر میں خاک نہ پیروں میں کوئی چھالا ہے

یا

ؔ شبِ غم کو اُجال رکھا ہے
ایک جگنو سنبھال رکھا ہے

پتھر کو پگھلانے میں تو وقت لگے گا
اس سے کچھ منوانے میں تو وقت لگے گا

یہ تینوں اشعار لفظی مصوری کی بہترین مثال ہیں۔
جاوید شیداؔ نے چھوٹی بحر میں جو غزلیں کہیں ہیں وہ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ چند اشعار دیکھیئے۔

شبِ فرقت وصال ہو جائے
زندگی بے مثال ہو جائے

یا

درد لازم ہے عاشقی کے لئے
درد کی آرزو کیا کیجے

دھوپ میں سایا بن جاتا ہوں
میری فطرت پیڑوں جیسی

•

عشق میں ہم نے اتنا سیکھا
عشق حقیقت ، زیست کہانی

شیدآ کی شاعری میں عشق و محبت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بکھری ہوئی کہانیاں بھی اپنے اصل روپ میں میں نظر آتی ہیں اور شاعران کو اپنے تجرباتی سفر میں اپنی زندگی کا حصہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیدآ اپنے ماحول کو دیکھ کُڑھتا ہے اس کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے مگر جب مایوسی ہوتی ہے تو بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے۔

میں نے تعلقات نبھائے تمام عمر
لیکن وہ میرے کام نہ آئے تمام عمر

یوں تو رہِ وفا میں بہت دور تک گئے
منزل کے کچھ نشان نہ پائے تمام عمر

ے کچھ ایسے چیختے ہیں درو بام آرزو
آسیب جسے زیست کے گھر میں ٹھہر گیا

شیدآ کی شاعری اس ''دشتِ شب'' میں لکھی گئی ہے اُس کو ہم سب پر مسلط کر دیا گیا ہے اسی لئے تو وہ کہتا ہے۔

ڈھونڈو ہزار کوئی بھی سایہ کہیں نہیں
اِک جلتی دوپہر ہے گزرگاہِ زندگی

یا

ے جو بات دل میں ہے وہ بتا دینا چاہیے
سینے سے اب یہ بوجھ ہٹا دینا چاہیے

کِرن کِرن یہاں زخمی ہے روشنی کا بدن
یہ کون تیشۂ شب آزما گیا اب کے

جاوید شیداؔ کی شاعری میں عشق و محبت کی چُبھن بھی پوُری آب و تاب سے نظر آرہی ہے کیونکہ فرد کا عشق ہی اسے افراد سے عشق پر مجبور کرتا ہے۔ یہ "دشتِ شب" ذات سے کائنات تک پھیل جاتا ہے ان کے کچھ اشعار دیکھئے۔

مانا کہ تیرے قُرب میں بھی جاں کا زیاں ہے
پر اس کے بنا بھی تو گزارہ نہیں ہوتا

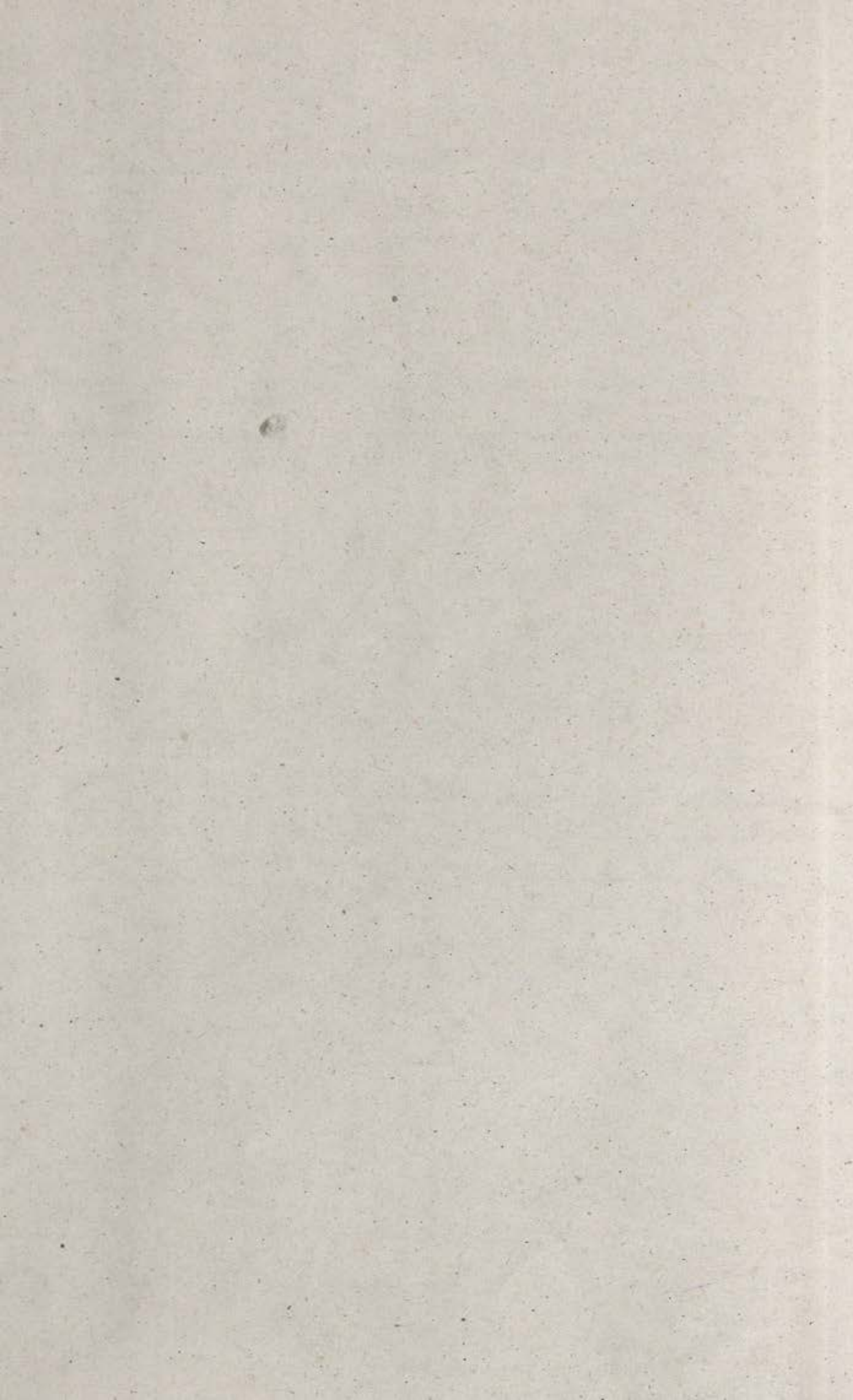
مرضِ عشق نہیں گھٹتا کسی صورت بھی
ہاں دُعا ہو کہ دوا اب تو اثر کم کم ہے

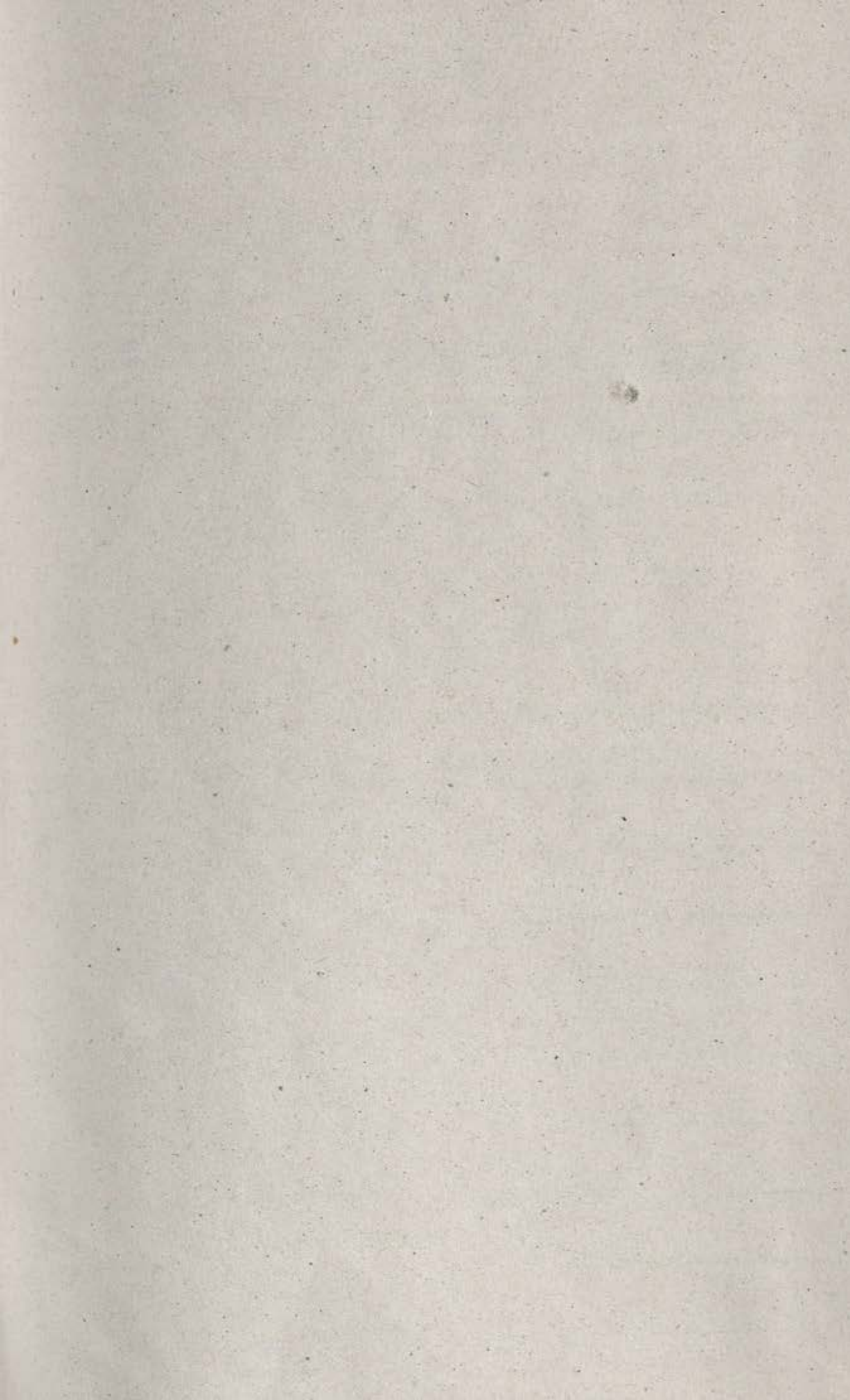
یہ دل اداس ہے صدیوں کے ہجر کا مارا
ذرا قریب تو آؤ بہار کے دن ہیں

جاوید شیداؔ ایک بہت مہذب اور شائستہ انسان ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ان کی شخصیت کا پرتو واضح نظر آتا ہے۔ ان کی اس کتاب کا سرورِق بھی بہت خوبصورت ہے کہ ناامیدی کے "دشتِ شب" میں امید کا چاند پھوٹ رہا ہے۔ میں ان کو اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا انہیں صحت کے ساتھ طویل عمر عطا کرے اور اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

پروفیسر دُرِ نجف زیبیؔ

یادداشت







میں دوست سیرت شاعر جاوید شیدؔا کے کلام سے اکثر محظوظ ہوتا رہتا ہوں شعر کے لسانی اور فنی پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ عروض کی متعینہ پابندیوں سے پوری طرح واقف ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ صرف عروضی ہو کر نہیں رہ گئے۔ خوش فکر اور خوش گو شاعر کو اپنے تخلص کا استعمال بھی خوب آتا ہے۔

شیدؔا کو لفظوں کا گہرا شعور حاصل ہے ان کے لیے لفظ کی اہمیت سے واقف ہونا کیفیت کی ترجمانی کا باعث ہے۔

جاوید شیدؔا ایک شاعر، کالم نگار، ڈرامہ نگار، تجزیہ نگار و محقق سبھی کچھ ہیں مگر ان کے اندر شاعری خصوصاً کافی کے سوتے کہیں اور سے پھوٹتے ہیں کوئی ہے جو راہ عدم پر چلے جانے کے باوجود لمحہ لمحہ ان کے ساتھ ساتھ ہے اور مشکل سے مشکل ترین منزلیں سر کروا رہا ہے۔

منیر نیازی
۱۴ / ۳ / ۲۰۰۴

بہت کٹھن تھے سبھی دن پہاڑ سے شیدؔا
بہانہ اب نہ بناؤ کہ شب نہیں کٹتی